5

محروم طبقوں کے حقوق

محروم طبقوں کے حقوق

خواتین

تمام شہری قانون کے روبرو، مساویانہ حیثیت رکھتے ہیں اور مساویانہ قانونی تحفظ کے حق دار ہیں، محض جنس کی بنا پر کسی شہری کے خلاف امتیازی سلوک روا نہیں رکھا جائے گا۔
اس آرٹیکل میں مذکور کوئی امر ریاست کی جانب سے خواتین اور بچوں کے تحفظ کے لیے خصوصی انتظامات کیے جانے میں مانع نہیں ہوگا۔
کسی بھی شہری کو، جو پاکستان کی سروسز میں تقرری کی اہلیت رکھتا ہے، محض جنس کی بنا پر اسے تقرری کے سلسلے میں امتیازی سلوک کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا۔
شق (1) میں مذکور کوئی امر ریاست کی جانب سے خواتین اور بچوں کے لیے خصوصی انتظامات کیے جانے میں مانع نہیں ہوگا۔
قومی زندگی کے تمام شعبوں میں، خواتین کی شرکت کو یقینی بنانے کے لیے اقدامات کیے جائیں گے۔ ریاست، ازدواجی زندگی، خاندان اور ماں کو تحفظ فراہم کرے گی۔

آئین پاکستان

[آرٹیکل نمبر 25-27-35-37]

تمام انسان آزاد پیدا ہوئے ہیں اور وقار اور حقوق کے سلسلے میں مساویانہ حیثیت کے حامل ہیں۔
اس اعلان میں جن آزادیوں اور حقوق کا ذکر ہے، ہر انسان ان پر بغیر کسی قسم کی تفریق کے حق رکھتا ہے۔
تمام انسان قانون کے روبرو مساویانہ حیثیت رکھتے ہیں اور بغیر کسی تفریق کے، مساویانہ قانونی تحفظ کے مستحق ہیں۔
ہر بالغ مرد اور عورت، شادی کے دوران اور شادی کے خاتمہ کے سلسلے میں مساویانہ حقوق رکھتا ہے۔
شادی مرد و زن کی آزادانہ اور مکمل رضامندی کے مطابق طے پانی چاہیے۔
ہر فرد کو اپنے ملک کی پبلک سروس تک مساویانہ رسائی کا حق حاصل ہے۔
ماں اور بچہ خصوصی سلوک اور مدد کے مستحق ہیں۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور

[آرٹیکل 1-2-7-16-21(2)-25-(2)]

صنفی تفاوت کے عالمی گوشوارے نے 2018 میں ایک بار پھر پاکستان کو صنفی برابری کے لحاظ سے دوسرا بدترین ملک قرار دیا ہے، عراق کے 147 ویں اور یمن کے 149 ویں نمبر کے درمیان 148 واں نمبر پاکستان کا ہے۔ یہ درجہ بندی معاشی شراکت اور مواقع، تعلیم کے حصول، صحت و بقاء، اور سیاسی خودمختاری کی بنیاد پر کی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پاکستان نے مساوی اجرت اور تعلیم کے حصول کے ذیلی گوشوارے کے حوالے سے خاطر خواہ ترقی کی ہے۔

انتخابات میں عورتوں کی بہت بڑی تعداد نے اپنا حق رائے دہی استعمال کیا

تاہم، یہ پیش رفت" ایسے ممالک کے مقابلے میں ناکافی سمجھی جارہی ہے جو عالمی درجہ بندی کے میدان میں اپنی کارکردگی میں نمایاں بہتری لارہے ہیں اور اس حوالے سے پاکستان کو تیزی سے پیچھے چھوڑ رہے ہیں۔"

عورتوں کی حالت زار تقریباً گذشتہ برسوں جیسی ہی رہی، اور عورتوں کو درپیش مسائل سارا سال خبروں کے ذریعے سامنے آتے رہے، خاص طور پر جنسی اور گھریلو تشدد کے واقعات کے حوالے سے جو اس قسم کے پدرسری معاشرے میں عام ہوتے ہیں۔ اگر دیگر عوامل بھی شمار کیے جائیں، جیسے کہ نام نہاد غیرت' کے نام پر قتل، تیزاب گردی، مشترکہ خاندانی نظام سے جڑے ہوئے مسائل، عورتوں کی نقل وحرکت اور نوکریوں پر عائد معاشرتی رکاوٹیں، عدم مساوات اور شدید غربت، جبری شادیاں اور خاندان کی طرف سے طے شدہ شادیاں تو صورتِ حال اور بھی گھمبیر ہو جاتی ہے۔

تاہم، کچھ مثبت پیش رفتیں بھی ہوئیں: قومی اسمبلی کی عام نشستوں کے لیے خواتین امیدواروں کی تعداد جتنی اس بار تھی اتنی پہلے کبھی نہیں رہی، انتخابات میں عورتوں نے پہلے سے زیادہ تعداد میں ووٹ ڈالے، خواجہ سراؤں کی بہتری کے لئے اقدامات کیے گئے، اور پاکستان کی ایک ہائی کورٹ میں پہلی خاتون چیف جسٹس کی تقرری ہوئی۔

قانون سازی

پچھلی ایک دہائی میں عورتوں کے حقوق پر بہت سے قوانین بنائے گئے ہیں۔ معاشرے میں کئی پُرتشدد اور غیر قانونی رسوم کا بدستور کارفرما رہنا اور ان میں مسلسل اضافہ ہونا، ایک بار پھر اس چیز کی نشاندہی کرتا ہے کہ قانون کے نفاذ اور سرایت پذیر معاشرتی رویوں کو بدلنے کے لئے بہت بڑے مسائل درپیش ہیں۔

نمایاں قوانین میں درج ذیل شامل ہیں:

- جائے روزگار پر خواتین کو ہراسانی سے تحفظ کا قانون 2010
- تیزاب گردی پر قابو پانے اور تیزاب سے منسلک جرائم کی روک تھام کا قانون 2011
- خواتین مخالف رسومات کے خاتمے کا قانون 2011 (خواتین کے وراثتی جائیداد کے حق کا تحفظ اور جبری شادیوں کی ممانعت بشمول تنازعات کا حل)
- گھریلو تشدد (روک تھام اور تحفظ) کا قانون 2012 میں منظور کیا گیا تھا۔ یہ قانون نجی مقامات پر تشدد کی ممانعت کرتا ہے اور مقدمات کا 90 دن کے اندر فیصلہ کرنے کا حکم جاری کرتا ہے۔
- غیرت کے نام پہ قتل کے خلاف قانون 2016
- جنسی زیادتی کے خلاف قانون 2016
- ہندو شادیوں کا قانون 2017

عدالتوں میں زیرالتواء مقدمات کے بہت بڑے انبار کو کم کرنے کے لئے متبادل تنازعہ ایکٹ 2017 منظور کیا گیا۔ یہ قانون غیر رسمی اور روایتی "عدالتوں" کو اختیار دیتا ہے کہ وہ 23 قسم کے دیوانی و فوجداری مقدمات نبٹا سکتی ہیں، جس میں شادی کو ختم کرنے اور نان نفقے کی ادائیگی، ذاتی ضرر اور جائیداد کے معاملات سے متعلقہ دیگر تنازعات شامل ہیں۔ یہ روایتی عدالتیں جن کو مقامی زبان میں پنچائیت یا جرگہ کہا جاتا ہے، دیہی علاقوں میں قبیلے اور علاقے کے عمائدین چلاتے ہیں، اور سول سوسائٹی اور انسانی حقوق کے کارکنان اِن روایتی عدالتوں کو خواتین کے حقوق کے لئے تاریخی طور پر نقصان دہ سمجھتے ہیں۔ خدشہ ہے کہ حفاظتی اقدامات نہ کیے گئے تو پھر حالیہ سالوں میں ہونے والی پیش رفت کے لئے لڑی جانے والی سخت لڑائی شدید متاثر ہوگی۔

اسلامی نظریاتی کونسل (سی آئی آئی) نے ستمبر 2018 میں اعلان کیا تھا کہ "تین طلاقوں" کے عمل کی حوصلہ شکنی ہونی چاہیے اور ایسے مرد جو شادی کا خاتمہ اس طریقے سے کرتے ہیں اُنہیں سزا ملنی چاہیے۔ کونسل نے طلاق کی دستاویز "طلاق نامہ" وضع کر کے علما کی منظوری کے لیے ان کے پاس بھیجنے کا بھی فیصلہ کیا۔ اسلامی نظریاتی کونسل ایک آئین ساز ادارہ ہے جو پارلیمان کو بتاتا ہے کہ آیا کوئی مخصوص قانون اسلامی تعلیمات کے منافی ہے یا نہیں۔

یہ امتیازی رواج مردوں کو خواتین کی زندگیوں پر قابو پانے کا اختیار دیتا ہے۔ اکثر اوقات زبانی طلاق کی کوئی وجوہات بیان نہیں کی جاتیں اور اس سے بیوی کے جائیداد میں حصہ، وراثت اور بچے کی تحویل کے حقوق شدید متاثر ہوتے ہیں۔ بہرحال، یہ امر واضح نہیں ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل کا یہ اعلان متبادل قانونی طریق ہائے کار کے لیے مشاورت اور قانون سازی کے مرحلے سے گزرے گا یا نہیں۔

مذہبی اقلیتی عورتوں اور لڑکیوں پر اثر انداز ہونے والے قوانین

مسیحی شادی وطلاق ایکٹ 2017 تنازعہ کا باعث بنا رہا۔ اکتوبر میں لاہور ہائی کورٹ نے مسیحی طلاق ایکٹ کی سابقہ شکل میں بحالی کے لیے ایک اپیل کی سماعت کی اور اس پر قانون سازی کے ضمن میں پارلیمان کی پیش رفت کے بارے میں دریافت کیا۔ اپیل کنندہ نے لاہور ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس کے فیصلے کو چیلنج کیا تھا جس کی رو سے مسیحی مردوں کو اپنی خواتین کو بدکاری کے الزام کے علاوہ دیگر وجوہ کے باعث بھی طلاق دینے کی اجازت مل گئی تھی۔

مذہبی اقلیتی برادری کی خواتین کو بدسلوکی کا نشانہ بننے کا زیادہ خطرہ لاحق ہے۔ پاکستان میں تحریک برائے یکجہتی وامن کی ایک رپورٹ کے مطابق، ہر سال مسیحی اور ہندو برادری سے تعلق رکھنے والی کم اَز کم ایک ہزار لڑکیوں کی مسلمان مردوں سے زبردستی شادی کی جاتی ہے۔ حکومت نے ان جبری شادیوں کو روکنے کے لئے کوئی خاص اقدامات نہیں کیے۔

انتخاب سے کچھ ہی عرصہ پہلے، پاکستان تحریکِ انصاف کے رہنما عمران خان نے عہد کیا تھا کہ ہندو لڑکیوں کی مسلمان مردوں سے جبری شادیوں کی روک تھام کے لئے مؤثر اقدامات کئے جائیں گے۔ اُن کا کہنا تھا کہ اُن کو سندھ میں مقیم ہندو برادری کی جانب سے شکایات موصول ہوئی ہیں۔ پاکستان میں بسنے والے ہندو خاندانوں کی ایک کثیر تعداد سندھ میں رہائش پذیر ہے اور ذرائع ابلاغ کی اطلاعات کے مطابق، ضلع عمرکوٹ میں ہر ماہ تقریباً 25 جبری شادیاں انجام پاتی ہیں۔

فوجداری قانون (اقلیتوں کا تحفظ) بل جو مذہب کی جبری تبدیلی کی ممانعت کرتا ہے، کو سندھ اسمبلی نے 2016 میں منظور کیا تھا لیکن اُس وقت کے گورنر نے اسلامی نظریاتی کونسل اور مذہبی جماعتوں کے دباؤ کی وجہ سے نظرثانی کے لئے واپس بھجوا دیا تھا تاکہ اِس بل کو ختم کر دیا جائے یا پھر اِس میں ترمیم کی جائے۔

خواتین اور معیشت

عالمی مالیاتی فنڈ (آئی ایم ایف) کی جون میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ کے مطابق، صنفی امتیاز کا خاتمہ پاکستان کے جی ڈی پی میں 30 فیصد تک اضافہ کر سکتا ہے۔ مشاہداتی اور تحقیقاتی اعداد وشمار کے ایک مقالے عورتوں کی معاشی خودمختاری کا حصول کے ایک اقتباس کے مطابق "تعلیم کے حصول کا افرادی قوت میں عورتوں کی شمولیت کے ساتھ انتہائی مثبت تعلق ہے۔" اس بات میں کوئی دو رائے نہیں ہوسکتی کہ افرادی قوت میں خواتین کی خودمختاری سے معیشت کو فروغ ملتا ہے، جو کہ بالآخر جی ڈی پی میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔

20 سال اور اس سے زیادہ عمر کی خواتین کے لئے مساوی تعلیم تک رسائی، مالی معاونت اور صحت کی سہولیات کے علاوہ ان کی حوصلہ افزائی والے اقدامات کرنے اور ان کے لیے موافق حالات پیدا کرنے سے افرادی

قوت میں خواتین کی شمولیت میں اضافہ ہوگا جو اس مقصد کو حاصل کرنے میں ہماری معاونت کرے گا۔ یہ رپورٹ ظاہر کرتی ہے کہ بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام کے ذریعے مشروط رقم کی منتقلی کو لڑکیوں کے سکول میں اندراج سے منسلک کرنے سے کچھ پیش قدمی دیکھنے میں آئی لیکن اصل مقصد رسمی معیشت میں خواتین کی شمولیت ہونا چاہیے جس تک ابھی بھی بہت ساری خواتین کی رسائی ممکن نہیں، اور جو خواتین کی خودمختاری کے لئے درکار ذرائع تک رسائی کو ممکن بنائے گا۔

جارج ٹاؤن انسٹیٹیوٹ برائے خواتین، امن وسلامتی کے 18-2017 کی فہرست میں 153 ممالک کی فہرست میں پاکستان 150 ویں درجے پر ہے۔ اس فہرست کا بنیادی مقصد خواتین، امن وسلامتی کے عالمی ایجنڈے اور پائیدار ترقی کے اہداف کو فروغ دینا ہے اور اس مقصد کے لیے دیگر شراکت داروں کو عورتوں کی شمولیت، انصاف اور سلامتی کے ایجنڈے کے گرد اکٹھا کرنا ہے۔

کم ترین درجہ بندی میں وہ ممالک شامل ہیں جن کا خواتین کے لئے روزگار کے مواقع اور امتیازی رسم و رواج سے متعلق عالمی سکور بدترین ہے۔ ڈبلیو پی ایس انڈیکس نے امتیازی رسم ورواج کو جانچنے کے لئے ایک نیا پیمانہ استعمال کیا ہے جو کہ گیلپ ورلڈ پول کے سوال سے اخذ کیا گیا تھا جس کے ذریعے لوگوں سے پوچھا گیا "اُن کے لئے یہ مکمل طور پر قابلِ قبول ہے کہ اُن کے خاندان کی کسی عورت کی اگر مرضی ہو تو وہ گھر سے باہر تنخواہ دار نوکری کر سکتی ہے؟" پاکستان میں اس تجویز سے 73 فیصد مردوں نے مخالفت کی تھی۔

پاکستان ان دس ممالک کی فہرست میں بھی شامل ہے جہاں بیٹوں کو بیٹیوں پر ترجیح دینے کا رجحان سرایت پذیر ہے جس کے نتیجے میں والدین شروع سے ہی صنف کے انتخاب کی طرف مائل ہوتے ہیں۔

خواتین اور کام کاج

اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام (یو این ڈی پی) اور یو این ویمن برائے صنفی مساوات و اختیارات نسواں (یو این ویمن) کی مارچ میں جاری ہونے والی ایک مشترکہ تحقیقی رپورٹ سرکاری انتظام و انصرام میں صنفی مساوات' کے مطابق سماجی شعبوں میں خواتین کی نمائندگی اور ترقی کی راہ میں پیش آنے والی معاشرتی رکاوٹیں بدستور موجود ہیں۔ اس تحقیق کے مطابق ایک ایسی کثیر جہتی حکمت عملی اپنائی جائے جو کہ معاشرتی و معاشی حقیقتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سرکاری شعبوں میں فیصلہ ساز سطح تک خواتین کی رسائی میں اضافے کا باعث بن سکے۔

مزید اس چیز کی بھی نشاندہی ہوئی ہے کہ افرادی قوت میں صنفی مساوات کے لیے بنیادی سطح پر کام کرنے کی بہت ضرورت ہے۔ اگرچہ پاکستان میں گزشتہ پندرہ سالوں میں خواتین کی افرادی قوت میں 50 فیصد سے زیادہ اضافہ ہوا ہے، پھر بھی ہر پانچ میں سے صرف ایک خاتون افرادی قوت کا حصہ ہے۔

پاکستان کی افرادی قوت میں عورت کی شمولیت بے شمار سماجی و اقتصادی اور ثقافتی عوامل پر منحصر ہے جن میں تعلیمی درجات، خاندان اور گھریلو رکاوٹیں، نقل و حرکت وغیرہ شامل ہیں۔ ویمینز ایکشن فار ہیٹر ورک پلیسز کی طرف سے کروائے گئے ایک صنفی آڈٹ کے مطابق، پاکستان کے لیبر قوانین خواتین کے لئے کام کرنے کا سازگار ماحول پیدا

افرادی قوت میں عورتوں کی شمولیت کا انحصار تعلیم کی سطح، خاندان اور گھریلو پابندیوں اور ٹرانسپورٹ پر ہے

نہیں کرتے اور دوسرے مسائل کے علاوہ مزدور اور مزدوروں کے حقوق کی تعریف کے ضمن میں بھی ناموافقت کا شکار ہیں۔ اس رپورٹ کے نتائج اور سفارشات اکتوبر میں ایک تقریب میں پیش کی گئیں جس میں ارکانِ پارلیمان، سیاسی کارکنان، سول سوسائٹی اور مختلف شعبوں میں کام کرنے والی خواتین نے شرکت کی تھی۔ جن اقسام کے تحت ان قوانین کا تجزیہ کیا گیا تھا اُن میں انجمن سازی کی آزادی یا اجتماعی سودا کاری کی آزادی، اُجرت، پیشہ ورانہ تحفظ اور صحت، کام کرنے کی جگہ پر جنسی ہراسانی کے خلاف حفاظت، عورتوں کے لئے مساوی کام اور مواقع اور زچگی کے دوران تعطیل اور فوائد کا حصول شامل ہیں۔

بین المذاہب ہم آہنگی اور عورتوں کے حقوق پر کام کرنے والے ایک ادارے امن و ترقی فاؤنڈیشن نے ملازمتوں میں عورتوں کے 15 فیصد کوٹے اور اقلیتوں، خاص طور پر خواتین کے لیے 5 فیصد ملازمتوں کے کوٹے کے اطلاق کا جائزہ لینے کے لئے ایک تحقیق کی۔ جولائی میں تحقیق کے نتائج جاری ہوئے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ 327 حکومتی شعبوں میں سے زیادہ تر نے کوئی جواب نہیں دیا، جبکہ 121 شعبوں اور اداروں کی ایک کثیر تعداد جنہوں نے جواب دیا، کا کہنا ہے کہ ملازمتوں کے کوٹے پر عملدرآمد نہیں کیا جا رہا۔ کچھ شواہد سے معلوم ہوا ہے کہ کوٹے کا نظام سرکاری شعبے میں عورتوں کی نمائندگی بہتر کرنے میں کسی حد تک مددگار ثابت ہوا ہے۔ لیکن عورتوں کو ابھی بھی کام اور دیگر سرگرمیوں کے مابین توازن رکھنے کے ساتھ ساتھ ثقافتی اور مذہبی مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ ملازمت کے رسمی شعبے میں کام کرنے والی عورتیں اپنے مسائل کے باوجود غیر رسمی شعبے میں کام کرنے والی خواتین سے بہتر حالت میں ہیں۔

عورتیں اور زراعت

اقوام متحدہ خواتین نے جولائی میں پاکستان میں دیہی عورتوں کی حالت: 2018 ' جاری کی جس کے مطابق، پاکستان کی آبادی کا تقریباً دو تہائی حصہ دیہی علاقوں میں رہائش پذیر ہے اور 75 فیصد عورتیں اور لڑکیاں زراعت کے شعبے میں کام کر رہی ہیں۔ خاندانی زمینوں اور کاروباری مہموں میں کام کرنے والی عورتوں کی 60 فیصد محنت کا کوئی معاوضہ نہیں دیا جارہا جبکہ صرف 19 فیصد عورتیں تنخواہ دار ملازمت کر رہی ہیں۔

کالج کی تعلیم رسمی اور تنخواہ دار ملازمت کے حصول میں مدد دیتی ہے۔ صرف تین فیصد دیہی خواتین کے پاس کالج کی ڈگری ہے اور اُن میں سے 57 فیصد اوسطاً 16000 روپے ماہانہ جیسی کم اُجرت کے عوض پرائمری اسکولوں میں اُستانیوں کے طور پر کام کرتی ہیں۔ رپورٹ کے مطابق، 15 سے 64 سال کی عمر کی دیہی خواتین میں خواندگی کا تناسب 35 فیصد ہے جبکہ شہری علاقوں میں یہ تناسب 69 فیصد ہے۔ 20 فیصد دیہی خواتین اپنا ذاتی کام کرتی ہیں۔ چھوٹے پیمانے کے کاروبار کے لئے مدد ابھی تک کم آمدنی والی صلاحیتوں اور اوسطاً قرضہ 25,000 روپے فی عورت تک محدود ہے۔

اس رپورٹ نے قومی معیشت میں شمولیت کی حکمت عملی کے اجراء پر روشنی ڈالی ہے، جس کا مقصد 2020 تک کم اَز کم 50 فیصد بالغ آبادی اور 25 فیصد بالغ خواتین کو مالی سہولیات تک آسان رسائی مہیا کرنا ہے۔ تاہم، صرف چند خواتین خاص طور پر وہ جو دیہی علاقوں میں رہائش پذیر ہیں، کو ہی ان سہولیات تک رسائی حاصل ہے۔ اس رپورٹ کا کہنا ہے کہ "دیہی خواتین شہر کاری، ماحولیاتی تبدیلی، ماحول کی تنزلی اور دھچکوں اور تکنیکی جدت کے

زرعی شعبے میں 75 فیصد عورتیں اور لڑکیاں کام کر رہی ہیں

نتیجے میں آنے والی تبدیلیوں سے مقابلے کے لئے تیار نہیں ہیں۔"

رپورٹ نے نتیجہ اَخذ کیا کہ دیہی زرعی مزدور عورتوں کے حقوق اور بھلائی کے لیے قانون سازی، حکمتِ عملی اور ایکٹیوزم کی ضرورت ہے۔ مزید برآں اِس رپورٹ نے نئی ٹیکنالوجی متعارف کروانے، دیکھ بھال کے غیر معاوضہ شدہ کام کی قدر اور دیکھ بھال کی معیشت، اور دیہی کاروباری خواتین، دیہی خواتین اور ماحولیاتی تبدیلی کے درمیان تعلق، سی پیک کے اثرات اور خواتین کے خلاف تشدد کے سلسلے میں تحقیق کی ضرورت کو اُجاگر کیا۔

گھر پر کام کرنے والے مزدور (محنت کش کا باب ملاحظہ کریں)

گھریلو ملازمین (بچے اور محنت کش کے ابواب بھی ملاحظہ کریں)

جنوری 2018 میں گوجرانوالا پولیس کی جانب سے 20 سالہ ملازمہ، انیس بی بی پر مبینہ تشدد کی اطلاع منظرِعام پر آئی۔ لڑکی کے آجر، بھاموالی گاؤں کے ایک زمیندار نے الزام لگایا تھا کہ انیس بی بی نے اُن کے گھر سے کچھ قیمتی اشیاء چرائی تھیں۔ اطلاعات کے مطابق، اس کو گرفتار کیا گیا اور اس پر تشدد بھی کیا گیا۔ وزیرِ اعلیٰ کی جانب سے ایک تفتیشی کمیٹی تشکیل دی گئی جس کمیٹی نے ان پولیس اہلکاروں کو قصوروار ٹھہرایا اور اُن کے خلاف کاروائی کی سفارش کی۔ دسمبر میں اپنی دو ملازماؤں، یاسمین اور صائمہ، کو چوری کے الزام میں بند اور ہراساں کرنے کے الزام میں ایک سابق وفاقی وزیر کے بیٹے کو سپریم کورٹ میں گرفتار کیا گیا۔

گھریلو ملازمین (زیادہ تر خواتین) جن میں ایک بڑی تعداد بچوں کی ہے، کی ہراسانی اور استحصال ایک ایسا مسئلہ ہے جس کو شاذونادر ہی منظرِ عام پر لایا جاتا ہے۔ متوسط اور اعلیٰ طبقے میں ناگزیر ورکرز سمجھی جانے والی ان خواتین کو اکثر و بیشتر کام کے طویل اوقات، کم اُجرت، بھاری کام کاج، بے آرامی، چھٹی کا نہ ملنا اور ان سب میں بدترین جسمانی ایذاء کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ حتیٰ کہ قدرے شفیق مالکان بھی اپنے گھریلو ملازمین کے ساتھ کوئی معاہدہ نہیں کرتے جس کا مطلب ہے کہ وہ ملازمین غیر درج شدہ اور بے نیابت ہی رہتے ہیں۔

خواجہ سراؤں کے حقوق (انصاف کی فراہمی کا باب بھی ملاحظہ کریں)

سال 2018 میں خواجہ سراؤں کے حقوق میں بہتری دیکھی گئی کیونکہ ریاست نے اُن تمام تحاریک کا مثبت جواب دیا جو کہ خواجہ سراؤں کے حقوق کے لیے کام کرنے والے کارکنوں نے چلائیں جن کا مطالبہ تھا کہ خواجہ سراؤں کے لیے سہولیات میں بہتری لائی جائے اور بطور شہری ان کے حقوق کے تحفظ و فروغ کے لیے قانون سازی کی جائے۔ اس حوالے سے سب سے دوررس اثرات والا اقدام خواجہ سراء افراد (حقوق کا تحفظ) بل 2018 کی منظوری تھا۔ یہ قانون خواجہ سراؤں کے اس حق کو تسلیم کرتا ہے کہ "انہیں ان کی مرضی کی صنفی شناخت کے طور پر پہچانا جائے"، جو کہ تمام خواجہ سراء برادری کے لئے ایک عظیم کامیابی ہے، جنہوں نے سالہا سال غیر مستند اور دھوکہ دہی کے الزامات کا سامنا کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی جنس کے تعین کے لئے ناگوار طبی معائنے اور طریق ہائے کار برداشت کئے ہیں۔

یہ قانون ملازمت، رہائش، تعلیم، صحت، اور ہراسانی؛ خاص طور پر گھر کے اندر اور گھر سے باہر ہونے والی ہراسانی" کی وضاحت کرتا ہے، اور ان سب معاملات میں خواجہ سراؤں کے ساتھ امتیازی سلوک سے منع کرتا ہے، لہٰذا، خواجہ سرا لوگوں کو اپنے خاندانوں سے تحفظ فراہم کرتا ہے۔ یہ قانون انہیں اسمبلی اور عوامی مقامات تک رسائی، ہراسانی سے تحفظ، روزمرہ کی عوامی زندگی اور معمولات میں قانونی تحفظ فراہم کرتا ہے۔ مزید برآں، یہ قانون اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ خواجہ سراؤں کو وراثتی حقوق، ووٹ ڈالنے کا حق، سرکاری ملازمت کا حق، اور جائیداد کی ملکیت کا حق حاصل ہو۔ چنانچہ اس نے اُن تمام قانونی رکاوٹوں کو دور کیا ہے جو خواجہ سراؤں کو دولت کے حصول اور ملک کے جمہوری عمل میں حصہ لینے سے روکتی ہیں۔ یہ قانون وفاقی محتسب، قومی کمیشن برائے حقوق نسواں (این سی ایس ڈبلیو) اور قومی کمیشن برائے انسانی حقوق (این سی ایچ آر) کو اس ایکٹ کے تحت حقوق کی خلاف ورزی کے خلاف درج شکایات کو حل کرنے کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے (ملکی قانون کے تحت شہریوں کے لیے عام فوجداری و دیوانی طریق ہائے کار اس کے علاوہ ہیں)۔

اس سال خواجہ سرا برادری کی بہتری کے لئے بیشتر اقدامات کیے گئے اور ان کی شناخت تسلیم کی گئی۔ ان اقدامات میں مارچ میں ایک نجی ٹیلی ویژن چینل میں ایک خواجہ سرا کی نیوز اینکر کے طور پر تقرری، لاہور میں اِن کی تعلیم اور پیشہ ورانہ تربیت کے لئے دی جینڈر گارڈین کے نام سے سکول کا افتتاح، اِس کے ساتھ ساتھ ایک اولڈ ایج ہوم جہاں مُفت طبی سہولیات اور رہائش دستیاب ہوگی، شامل ہیں۔ پہلی دفعہ، مارچ میں خیبر پختونخوا پولیس نے رسمی طور پر 30 خواجہ سراؤں کو ڈرائیونگ لائسنس جاری کرنے کے علاوہ انہیں ڈرائیونگ کی تعلیم بھی دی۔ ایسا ہی ایک اقدام جون میں لاہور گارڈین نے اپنا ایک منصوبہ شروع کر کے کیا جس کے تحت خواجہ سراؤں کو ڈرائیونگ سکھائی گئی تاکہ وہ ٹیکسی سروس کے ساتھ منسلک ہو سکیں۔

آزاد و شفاف الیکشن نیٹ ورک (فافن) نے کراچی میں نے پہلی مرتبہ 25 کے قریب خواجہ سراؤں کو الیکشن مبصر کے طور پر مقرر کیا۔ یہ ایک ایسا قدم تھا جس کا مقصد معاشرے کے کمزور طبقات جیسے کہ معذوری کے شکار افراد، خواجہ سراؤں اور عورتوں کے انسانی حقوق کو تحفظ دینا اور انتخابی عمل میں ان کے فعال کردار کو فروغ دینا تھا۔

عورتوں، لڑکیوں اور خواجہ سراؤں پر تشدد (اعداد و شمار کے لئے امن و امان کا باب ملاحظہ کریں)

اس رپورٹ کے شائع ہونے تک، وفاقی حکومت سے درست، تصدیق شدہ، قومی سطح پر مطابقت رکھنے والے اور مرتب شدہ اعداد و شمار حاصل نہیں کئے جا سکے تھے۔ غیر رسمی طور پر حاصل شدہ اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ صنفی بنیادوں پر تشدد کی درست تصویر کشی کے لیے رپورٹنگ کے نظام کو اور زیادہ مضبوط کرنے کی ضرورت ہے۔ سیڈا اور سی آر سی کی فریق ریاست ہونے کی حیثیت سے، پاکستان کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ انسانی حقوق کی صورتحال، خاص طور پر خواتین کے حقوق، بچوں اور اقلیتوں کے حقوق پر مبنی حقیقی اور درست رپورٹس اقوامِ متحدہ کے متعلقہ کمیشنوں کو

پیش کرے۔ تاہم، کسی بھی قابلِ اعتماد اعداد و شمار کی غیر موجودگی میں ریاست کو ان رپورٹس کا ذمہ دار ٹھہرانا مشکل ہو جاتا ہے جو وہ تیار کرتی ہے۔

خواتین، امن اور سلامتی کے گوشوارے 18-2017 کا کہنا ہے کہ پاکستان میں 27 فیصد خواتین "اپنی زندگی میں اپنے قریبی ساتھی کی طرف سے یا گھریلو تشدد" کا شکار ہیں، اور صرف 51 فیصد کا ماننا ہے کہ وہ اپنی برادریوں میں محفوظ ہیں۔

ہر طبقے کی خواتین مسلسل ظالمانہ تشدد برداشت کر رہی ہیں۔ عورتوں کی ایک بہت بڑی تعداد کا بہیمانہ قتل اُن کے اپنے ہی جاننے والے مردوں کے ہاتھوں ہوا ہے، جن میں زیادہ تر اُن کے خاندان کے لوگ شامل تھے۔ باپ، خاوند، بھائی اور سسرال کے ہاتھوں قتل ہونے والی خواتین کے قتل کی وجہ "غیرت/عزت" کو قرار دیا گیا، اگرچہ مزید تفتیش سے ظاہر ہوا کہ ان واقعات کے محرکات کچھ اور تھے۔

بیٹیاں اپنے شریکِ حیات کے چناؤ کے معاملے میں اپنی خواہش ظاہر کرنے پر اپنے والد کے ہاتھوں قتل ہوئیں۔ نومبر میں، گوجرانوالہ میں سولہ سالہ سارا کو اُس کے باپ اور چچا نے پسند کی شادی کی خواہش ظاہر کرنے پر قتل کر دیا۔ اپریل میں، اطالوی شہریت رکھنے والی ثناچیمہ کا واقعہ پوری دنیا میں خبروں کی زینت بن گیا۔ گجرات میں اُس کے خاندان نے یہ کہا کہ اس کی موت ایک غیر تشخیص شدہ بیماری کی وجہ سے ہوئی تھی۔ ایک اطالوی جریدے کی رپورٹ منظرِ عام پر آنے کے بعد، قبر کشائی کے ذریعے اس کی لاش کو نکالا گیا جس سے پتا چلا کہ اسے غیرت کے نام پہ قتل کیا گیا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں انکشاف ہوا کہ اسے گلا گھونٹ کر مارا گیا اور پولیس کا کہنا تھا کہ اس کے باپ اور بھائی نے اس کے قتل کا اعتراف کیا ہے۔

خاوند اپنی بیویوں کو بے وفائی کے شبے میں قتل کرتے رہے اور انہوں نے پولیس کو دیے گئے اپنے بیان میں کہا کہ انہوں نے مضبوط شکوک کی بناء پر قتل کیا تھا۔ جن خواتین نے اپنے شریک حیات کے انتخاب میں اپنی مرضی کی یا کرنے کی کوشش کی وہ اپنے باپ اور بھائیوں کے ہاتھوں قید، مار پیٹ اور جان لیوا تشدد کا نشانہ بنیں۔ جن مردوں کے رشتوں کو ٹھکرایا گیا انہوں نے اپنا انتقام ان خواتین کو بہیمانہ تشدد کا نشانہ بناتے ہوئے لیا جن سے وہ شادی کرنا چاہتے تھے،، اور اکثر ایسی خواتین کے چہروں کو تیزاب پھینک کر مسخ کیا گیا۔

سیالکوٹ میں، عاصمہ نامی خاتون کو ایک شخص نے تیزاب حملے کا نشانہ بنایا جس سے اس کا 90 فیصد جسم جھلس گیا۔ اطلاعات کے مطابق متاثرہ خاتون نے ملزم کا رشتہ ٹھکرایا تھا۔ اس چوبیس سالہ لڑکی کی بعد ازاں ہسپتال میں موت واقع ہوگئی۔ شادی کا رشتہ ٹھکرائے جانے کے معاملے پر جامعہ گجرات کی تین طالبات تیزاب گردی کا شکار ہوئیں۔ ان میں سے دو طالبات بہنیں تھیں۔ واقعے کا مرکزی ملزم ان بہنوں کا ماموں تھا جو اسلام آباد پولیس کا ایک اہم افسر تھا اور اس کے دونوں ساتھی کیپٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی (سی ڈی اے) کے ملازم تھے۔ ستمبر میں، ایک شخص نے پُرہجوم بازار میں اپنی بیوی، اس کی والدہ اور اپنے پانچ بچوں پر تیزاب پھینک دیا، کیونکہ ذرائع کے مطابق اس کی بیوی

حکام نے 'غیرت' کے نام پر قتل کے الزامات کے بعد ثناء چیمہ کی قبر کشائی کی

اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔

سندھ پولیس کے ایک سابق آئی جی نے نومبر میں کراچی میں منعقد ہونے والے ایک سیمنار جس کا عنوان خواتین اور لڑکیوں پر تشدد بند کرو' تھا سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ پنجاب میں 'غیرت" سے متعلقہ جرائم کی شرح سب سے زیادہ ہے، جبکہ سندھ، خیبر پختونخواہ اور بلوچستان بالترتیب دوسرے، تیسرے اور چوتھے نمبر پر آتے ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ پاکستان میں 87 فیصد خواتین اور 13 فیصد مرد اس تشدد کا شکار ہوئے۔

اپنی برادریوں میں اختلافات کو حل کرنے، اور انصاف' پر عمل درآمد کرنے کے لئے اجتماعی جنسی زیادتی پنچائیت اور گاؤں کے عمائدین کا بنیادی طریقہ بن چکا ہے۔ اجتماعی جنسی زیادتی خواجہ سراؤں کی برادریوں کو بھی ایک وبا کی طرح متاثر کر رہی ہے، جو معاشرے میں اپنے غیر اہم رُتبے اور مزدوری کی بنیادی اقسام جیسے کہ بھیک مانگنے، شادی بیاہ اور جنازوں پر دعائیں دینا، خوشی کے مواقع پر ناچنا اور جسم فروشی کے باعث غیر محفوظ ہیں۔ تکنیکی ماہرین اس بات سے متفق ہیں کہ جنسی اور اجتماعی زیادتی کے درج ہونے والے واقعات کی تعداد اصل تعداد سے بہت کم ہے۔ درخواست درج کرانے کے نظام کی مسلسل غیر موجودگی اور ایسے واقعات کے حوالے سے حساس ماحول عورتوں اور خواجہ سراؤں کی حوصلہ شکنی کرتا ہے۔

فروری 2018 میں، لاہور پولیس کے تفتیشی شعبے اعلان کیا تھا کہ وہ صنف کی بنیاد پر ہونے والے تشدد کے خاتمے کے لئے ایک نئی شاخ قائم کریں گے اور جنسی تشدد کے متاثرین کو تحفظ فراہم کریں گے۔ انہوں نے اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ خواتین کے خلاف تشدد خاص طور پر جنسی زیادتی خوفناک جرائم اور بہت حساس نوعیت کے

معاملات ہیں، اوران سے ماہرانہ طور پر نمٹنے کے لئے پیشہ ورانہ مہارت کی ضرورت ہے۔ علاوہ ازیں، اس حقیقت کو بھی تسلیم کیا گیا کہ پولیس فورس میں مردوں کا غلبہ ہے اور لاہور پولیس افسران کی صلاحیتوں میں اضافے اور خصوصی تربیت کے لئے جامع منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔

یہ عمل ایک طویل عرصے سے التوا کا شکار ہے۔ اس کا مخلصانہ اور سنجیدہ نفاذ کامیابی کی کنجی ہے اور یہی وہ نقطہ ہے جہاں تمام اقدامات کم پڑ جاتے ہیں۔ خواتین پر تشدد اور صنفی بنیادوں پر ہونے والے مسائل سے متعلق حساسیت اور آگہی کی کمی کا مسئلہ بدستور موجود ہے۔

خواجہ سرا افراد خاص طور پر پولیس کے ہاتھوں ہراسانی، ذلت، تشدد بشمول جنسی تشدد کا نشانہ بنتے ہیں۔ لیکن پیدائشی صنف کے اعتبار سے عورت کہلائے جانے والی خواتین بھی جب پولیس کے پاس جنسی جرائم کے خلاف درخواست لے کر جاتی ہیں تو ان کے ساتھ بھی کچھ اچھا سلوک نہیں کیا جاتا۔ کچھ خواتین پولیس تک رسائی تو حاصل کر پائیں لیکن بہت کم واقعات میں ایف آئی آر درج کی گئی اور گرفتاریاں کی گئیں۔ بہت کم لوگوں کو سزا ہوئی۔

خواجہ سراؤں پر حملے، جنسی زیادتی اور قتل کے واقعات کی زیادہ تر اطلاعات خیبر پختونخواہ سے موصول ہوئیں۔ تاہم، پنجاب اور سندھ ہونے والی قانون کی خلاف ورزیوں کی نوعیت سے پتا چلتا ہے کہ ملک کے مختلف حصوں میں ان کے ساتھ ہونے والے سلوک میں نمایاں امتیاز نے نہیں بلکہ ان صوبوں میں خواجہ سراؤں کے حقوق کی تنظیموں کے کارکنان کے بڑھتے ہوئے ایکٹیوازم نے ان خلاف ورزیوں کو اجاگر کیا ہے۔ اس برادری کے اندر سے ہی ملنے والے بیانیے اس خیال کو تقویت دیتے ہیں۔

حالیہ وقتوں میں، بلوچستان میں حقوقِ نسواں کی درست صورتِ حال کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ پیمرا کی پابندیوں کی وجہ سے میڈیا پر کرفیو کی صورتِ حال اور بلوچ خبر رساں ذرائع تک انتہائی کم رسائی اور پاکستان کے سب سے کم ترقی یافتہ صوبے میں انسانی حقوق کے ڈھانچے کی زبوں حالی کی وجہ سے موصول ہونے والی خبروں کی بنیاد پر موجودہ حالات کے بارے میں صرف محدود اندازے ہی لگائے جا سکتے ہیں۔ عمومی طور پر، بلوچستان میں انسانی حقوق کی صورتِ حال انتہائی خراب ہے۔ خواتین روایتی پدرانہ ڈھانچے، ریاستی تشدد، ریاستی نظر اندازی اور وسیع سیاسی اختلافات میں جکڑے رہ کر اپنی روزمرہ زندگی میں اپنی بقاء کے لئے جدوجہد کر رہی ہیں۔

موجودہ قلیل اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ ملک کے دیگر حصوں کی طرح، بلوچستان میں بھی عورتوں سے نفرت پر مبنی ظالمانہ تشدد عام ہے جس میں عورتوں اور لڑکیوں دونوں کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔ جنسی زیادتی، اغواء اور قتل کے واقعات عام ہیں۔ بلوچستان میں فرق یہ ہے کہ مقامی لوگ زیادہ تر متشدد کارروائیوں خاص طور پر اغواء کا ذمہ دار ریاست کو ٹھہراتے ہیں۔ بلوچستان میں گمشدگیاں عام ہیں اور ہمیشہ ریاستی عناصر کو ہی شک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے لیکن خواتین کے اغواء کی تصدیق یا تردید نہ ہونے کے باعث یہ واقعات اغواء اور گمشدگیوں کے مجموعی واقعات کا حصہ بن جاتے ہیں۔ بلوچستان میں خواتین پر ہونے والے تشدد کے محرکات کو قومیت، وسائل کے انتظام سے متعلق

خدشات اور ایسے ہی دوسری شکایات جو بلوچوں کو ریاست سے ہیں، کے ذریعے ہوا ملتی ہے۔

خواتین اور انتخابات

الیکشن ایکٹ 2017 میں ایک دفعہ کا سیاسی جماعتوں سے تقاضا ہے کہ وہ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کی عام نشستوں پر کم اَز کم 5 فیصد ٹکٹ عورتوں کو جاری کریں۔ حالیہ انتخابات میں، پچھلے تمام انتخابات کی نسبت عام نشستوں پر خواتین امیدواروں کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔

تمام جماعتوں کی خواتین سیاسی کارکنان نے شکایت کی کہ انتخابات میں ان کی شمولیت بنیادی طور پر صرف نمائندگی کے لئے درکار کم ترین معیار پر پورا اترنے کے لئے تھی۔ ایسی خواتین امیدواروں کے علاوہ جن کو ان کی جماعتوں نے حتمی طور پر منتخب کیا تھا، انتخابات کے دوران ایسی کئی مثالیں دیکھنے میں آئیں جہاں حقیقت میں خواتین امیدواروں سے ٹکٹ لے کر مردوں کو دے دی گئیں کیونکہ اُن کا خیال تھا کہ مردوں کے انتخابات جیتنے کے امکانات زیادہ تھے۔ امیدواروں کی فہرست کی جانچ سے یہ بات سامنے آئی کہ منتخب خواتین امیدواروں کی بڑی تعداد کا تعلق بااثر اور نامور سیاسی خاندانوں سے تھا۔

الیکشن کمیشن آف پاکستان کے ضوابط کے مطابق، اگر ایک حلقے میں ڈالے گئے ووٹوں کی کل تعداد میں خواتین کا حصہ 10 فیصد سے کم ہو تو انتخابات کے نتائج کو کالعدم قرار دیا سکتا ہے۔

2013 میں انتخابات سے پہلے کے عرصے میں صنفی انتخابی تفاوت میں 10 کروڑ 79 لاکھ سے ایک کروڑ بیس لاکھ تک اضافے کا تخمینہ لگایا گیا۔ بہت سی خواتین کا قومی شناختی کارڈ نہیں بن پاتا جس کے بغیر ووٹ ڈالنا ناممکن ہے۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان نے نادرا اور سول سوسائٹی کے تعاون سے ایمرجنسی رجسٹریشن کی مہم کا آغاز کیا، جو ہر طرف پھیلی ہوئی ناخواندگی اور دوسری رکاوٹوں جیسے کہ مرد رشتے داروں اور مقامی بزرگوں کی طرف سے مزاحمت کی وجہ سے صرف جزوی طور پر کامیاب ہو سکی۔

اس کے نتیجے میں، شانگلا اور جنوبی وزیرستان کے انتخابات کو کالعدم قرار دے دیا گیا کیونکہ وہاں خواتین ووٹرز کا تناسب 10 فیصد سے کم تھا۔ شانگلا میں دوبارہ ہونے والے انتخابات کے دوران، مرکزی امیدواروں کے حق میں پڑنے والے ووٹوں کی تعداد میں اضافہ ہوا، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خواتین ووٹرز کو جبراً نکالا گیا اور پچھلے انتخاب میں جیتنے والے امیدوار نے پہلے سے بھی زیادہ فرق سے کامیابی حاصل کی۔

دیر بالا میں، جہاں تاریخ میں پہلی بار عام نشست پر ایک خاتون نے انتخاب لڑا، خواتین کے باہر نکلنے سے ضلع میں ڈلنے والے ووٹوں کا تناسب 30-25 فیصد سے بڑھ کر 50–45 فیصد ہو گیا۔ اس مرتبہ، سیاسی جماعتوں نے خواتین کو ووٹ ڈالنے کیلئے باہر نکالنے میں فعال کردار ادا کیا، اور انہیں تربیت اور رہنمائی فراہم کی۔ پولنگ سٹیشنوں تک جانے کے لئے سواری کا انتظام بھی کیا گیا۔

گزشتہ سالوں کے مقابلے میں، اَپر دیر کے تقریباً تمام سات حلقوں میں خواتین کے ووٹ ڈالنے کا

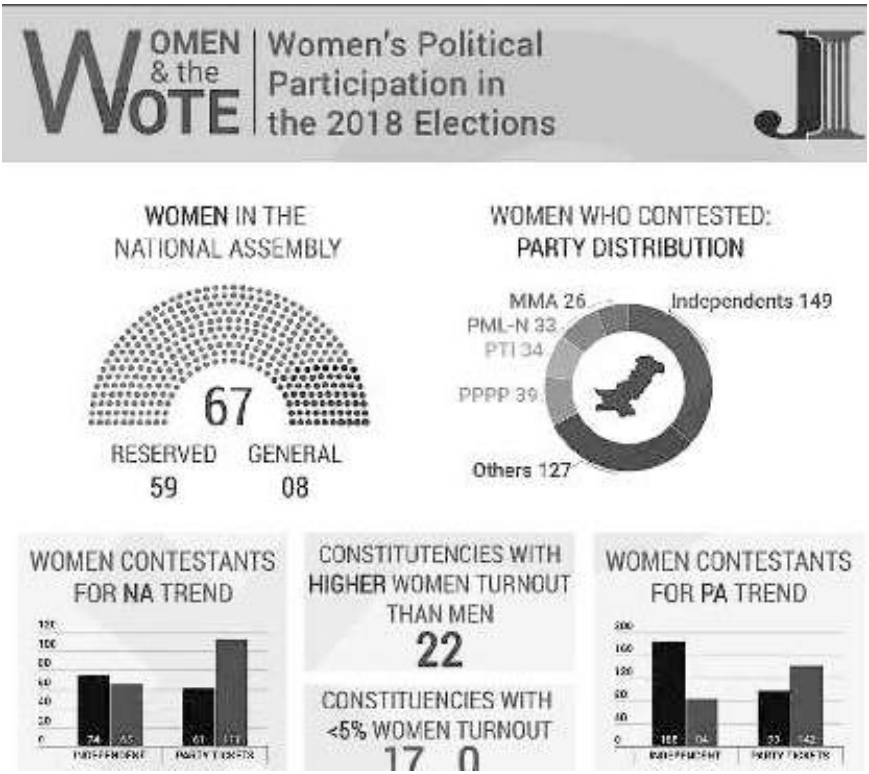

ذریعہ معلومات: الیکشن کمیشن پاکستان (ای سی پی)

تناسب کافی زیادہ رہا اور ضلع میں 93,000 سے زائد خواتین نے اپنے ووٹ کا حق استعمال کیا۔

نمایاں طور پر، دو قدامت پسند جماعتوں، جمعیتِ علماء اسلام – فضل اور جماعت اسلامی، جنہوں نے ماضی میں خیبر پختونخواہ کے سیاسی انتخابی عمل میں خواتین کی شمولیت کی شدید مخالفت کی تھی، خاص طور پر دور دراز علاقوں جیسا کہ دیر میں، نے خواتین کے ووٹ ڈالنے کی حوصلہ افزائی کے لئے فعال مہم چلائی۔

یہ پہلا سال تھا جب مئی میں خواجہ سراؤں کے حقوق کو قانونی حیثیت ملنے کے بعد خواجہ سراء امیدواروں نے بھی انتخاب لڑا۔ پاکستان میں صوبائی اسمبلی کی نشست کے لئے گیارہ خواجہ سراؤں نے انتخاب لڑا جبکہ دو مزید خواجہ سراؤں نے قومی اسمبلی کی نشست کے لئے انتخاب لڑا۔ انتظامیہ نے ووٹرز اور امیدواروں کے لئے صنف تعین ختم کر دیا اور اُن کو تمام سرکاری کاغذات میں اپنی صنفی شناخت خود منتخب کرنے کا حق دے دیا۔

ایک ایسے معاشرے میں جہاں شیدی قبیلے کے آباؤ اجداد کا تعلق افریقہ سے ہونے کی بناء پر ان کے ساتھ امتیاز روا رکھا جاتا ہے، تنزیلہ قنبرانی پہلی شیدی خاتون ہیں جو سندھ اسمبلی میں پی پی پی کی جانب سے اقلیتوں کے لئے مختص کوٹہ پر منتخب ہوئیں۔ پی پی پی کی ایک اور امیدوار کرشنا کماری سینٹ میں منتخب ہونے والی پہلی ہندو دَلت خاتون

ہیں۔محترمہ کماری تھرپارکر کی رہائشی ہیں جہاں 2018 کے انتخابات میں خواتین نے تقریباً 73 فیصد شرکت کے ساتھ ایک ریکارڈ قائم کیا۔

خواتین اور خاندانی منصوبہ بندی

سال کے شروع میں، ملک کی تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی پر تشویش کا اظہار کیا گیا۔ ملک کی موجودہ آبادی 20 کروڑ سے زیادہ ہے اور اس میں سالانہ 2.4 فیصد اضافہ کی شرح سے اضافہ ہو رہا ہے۔ سپریم کورٹ نے جولائی میں ازخود نوٹس لیتے ہوئے ایک کمیٹی قائم کی تاکہ آبادی پر قابو پانے کے لئے ایک یکساں پالیسی تشکیل دی جاسکے۔

اپنی مرضی کا انتخاب کرنے کا مطلب ہے کہ ایک عورت کو اپنی صحت پر زیادہ اختیار حاصل ہے اور وہ یہ فیصلہ کرسکتی ہے کہ اس نے اُجرت پر افرادی قوت میں شامل ہونا یا اس کا حصہ رہنا ہے یا نہیں۔ اقوام متحدہ آبادی فنڈ (یو این ایف پی اے) کی اکتوبر میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ کے مطابق، یہ فیصلہ "عورتوں اور لڑکیوں کی بہبود میں تیزی سے بہتری لاسکتا ہے، خاندانوں کی حالت بدل سکتا ہے اور عالمی ترقی کو فروغ دے سکتا ہے"۔ یو این ایف پی اے کے مطابق، پانچ میں سے صرف ایک شادی شدہ خاتون جو حمل کو روکنا چاہتی ہے، مانع حمل کے مؤثر طریقوں تک رسائی کے قابل نہیں ہے، باوجود اس حقیقت کے کہ اس سے غربت میں کمی لائی جاسکتی ہے، زچہ و بچہ کی جان بچائی

لیڈی ہیلتھ ورکرز اکثر اوقات دیہی عورتوں کے مانع حمل اشیاء تک رسائی کا واحد ذریعہ تھیں

جاسکتی ہے، اور معاشی ترقی کے مواقع فراہم کیے جاسکتے ہیں۔ فروری میں شائع ہونے والی یونیسف کی ایک رپورٹ کے مطابق، پاکستان میں ہر بائیس میں سے ایک نوزائیدہ بچے کی پیدائش کے پہلے ماہ ہی موت واقع ہوجاتی ہے۔ وسیع پیمانے پر پھیلی ہوئی غربت اور حمل کے دوران غذائیت سے متعلق لاعلمی، خواتین کی نشوونما میں رکاوٹ کا باعث بنتی ہے جس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بچے نہایت لاغر اور کمزور ہوتے ہیں، جن کو بظاہر بے ضرر بیماریاں لاحق ہونے کا شدید خطرہ ہوتا ہے۔ حمل کے دوران نامناسب دیکھ بھال اس کی ایک اور وجہ ہے۔

آبادی کونسل کے تحت دسمبر میں ایک قومی مباحثہ کا اہتمام کیا گیا۔ کنٹری ڈائریکٹر کے مطابق، "پاکستان میں حمل سے متعلقہ وجوہات کی بناء پر سالانہ 12,000 ماؤں کی موت واقع ہوجاتی ہے جبکہ ہر سال ملک میں لاکھوں کی تعداد میں جوڑے غیر مطلوب پیدائش کو برداشت کرتے ہیں۔" سپریم کورٹ کی ٹاسک فورس نے آبادی سے متعلق جو سفارشات پیش کیں ان میں خاندانی منصوبہ بندی تک عالمگیر رسائی اور تولیدی صحت کی سہولیات کو یقینی بنانا، مانع حمل اشیاء تک رسائی، نصاب اور تربیت، اور مذہبی علماء کا کردار شامل ہیں۔ ملک میں شرح پیدائش کے تغیر کو تیز کرنے کے لئے مؤثر قانون سازی کی ضرورت پر زور دیا گیا، اس کے ساتھ ساتھ تمام عوامی اداروں میں رضامندی سے خاندانی منصوبہ بندی کی یقین دہانی کی خاطر انقلابی نقطہء نظر اختیار کرنے اور 2025 کے قومی وژن اور پائیدار ترقیاتی اہداف کے حصول کے لئے ٹھوس منصوبہ بندی پر بھی زور دیا گیا۔

سفارشات

☆ مسیحی شادی وطلاق بل کو پہلے سے زیادہ بہتر بنانے کے لئے، مسیحی برادری میں اتفاقِ رائے کو فروغ دیا جائے، اور پارلیمان اور صوبائی اسمبلیوں کی جانب سے اس کی جلد از جلد منظوری کو یقینی بنایا جائے۔

☆ اعلیٰ تعلیم تک بہتر رسائی، مالی سہولیات، اور صحت کی سہولیات نیز مراعاتی پالیسیوں کے ذریعے بیس سال اور اس سے زیادہ عمر کی خواتین کی افرادی قوت میں شمولیت میں اضافہ کیا جائے تاکہ عورتوں کی حوصلہ افزائی اور معاونت کی جاسکے۔

☆ عورتوں کے لئے ملازمت کے مواقع پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ تمام صوبوں اور علاقوں میں قومی سطح پر غیر رسمی تعلیمِ بالغاں اور پیشہ ورانہ مہارت کے تربیتی منصوبوں کا آغاز کیا جائے۔

☆ این جی اوز/سی ایس اوز اور سرکاری/نجی/بغیر سود کے ترقیاتی بنکاری کے آزمائے ہوئے کامیاب منصوبوں کی تقلید کرتے ہوئے قلیل ترین آمدنی والی خواتین کو کاروباری منصوبوں تک رسائی کے لئے مناسب زرِمبادلہ فراہم کیا جائے۔

☆ 2018 میں اقوامِ متحدہ خواتین کی پیش کردہ رپورٹ پاکستان کی دیہی خواتین کی حالت: '2018 کی سفارشات کی حمایت کی جائے اور ان کا اطلاق کیا جائے۔ ان سفارشات میں زرعی شعبے میں کام کرنے والی خواتین کے حقوق اور بہبود کے لیے قانون سازی، حکمتِ عملی اور تحقیق شامل ہیں۔

☆ صنفی بنیادوں پر ہونے والے تشدد پر قابو پانے کے لئے علیحدہ وِنگر/مراکز کا قیام عمل میں لایا جائے، اور جنسی تشدد کے شکار لوگوں کو تحفظ فراہم کیا جائے۔ ایسے واقعات سے نمٹنے کے لئے پولیس کو خاص تربیت دی جائے۔ تمام صوبوں میں عورتوں کے لئے پناہ گاہیں اور کرائسسز سنٹر مہیا کئے جائیں۔

☆ خاندانی منصوبہ بندی اور تولیدی صحت کی سہولیات تک عالمگیر رسائی کو یقینی بنانے کے لئے پالیسی بنائی جائے اور قانون سازی کی جائے۔ حمل کے دوران مناسب دیکھ بھال اور غذائیت کے بارے میں آگاہی کے منصوبوں میں اضافہ کیا جائے۔

محروم طبقوں کے حقوق

بچے

چودہ برس سے کم عمر بچے کو کسی فیکٹری یا دکان یا کسی دوسرے خطرناک پیشے میں ملازم نہیں رکھا جائے گا۔

آئین پاکستان

[آرٹیکل-11(3)]

ریاست اس بات کو یقینی بنانے کے لیے تمام ضروری اقدامات کرے گی۔۔۔ کہ بچوں کو ان پیشوں میں ملازم نہیں رکھا جائے گا جو ان کی عمر سے مطابقت نہیں رکھتے۔

آئین پاکستان

[آرٹیکل 37-(O)]

بچپن خاص توجہ اور مدد کا مستحق ہے۔

بچوں کے حقوق کے متعلق اقوام متحدہ کا میثاق

[دیباچہ]

بچوں کے متعلق عمل میں لائی گئی تمام کارروائیوں میں، چاہے وہ سرکاری یا نجی سوشل ویلفیئر اداروں کی طرف سے عدالتوں، انتظامیہ سے تعلق رکھنے والے حکام یا قانون ساز اداروں کی طرف سے عمل میں لائی گئی ہوں، بچوں کے بہترین مفادات کو اولین فوقیت دی جائے گی۔

[بچوں کے حقوق کے متعلق اقوام متحدہ کا میثاق]

[آرٹیکل 3(1)]

فریق ریاستیں بچے کے اس حق کو تسلیم کرتے ہوئے کہ وہ معاشرے میں میسر صحت کی اعلیٰ ترین خدمات اور سہولتوں، بیماریوں کے علاج اور صحت کی بحالی کے ذرائع سے استفادہ کرنے کا حق رکھتا ہے، اس امر کو یقینی بنانے کے لیے کوشش کریں گی کہ کوئی بچہ/ بچی صحت کی خدمات تک رسائی کے اس حق سے محروم نہ رہے۔

بچوں کے حقوق سے متعلق اقوام متحدہ کا معاہدہ

[آرٹیکل]24

پیدائش کے فوراً بعد بچے کا اندراج کرایا جائے گا اور اس کا نام رکھا جائے گا، اسے قومیت کا حق حاصل ہوگا اور جہاں تک ممکن ہوا سے اپنے والدین کو جاننے اور ان کے زیر سایہ پرورش پانے کا حق ہوگا۔

بچوں کے حقوق سے متعلق اقوام متحدہ کا میثاق

[آرٹیکل 7]

فریق ریاستیں بچے کے اس حق کو تسلیم کرتی ہیں کہ اسے معاشی استحصال، خطرناک سرگرمیوں اور تعلیم میں رکاوٹ بننے والے کاموں میں شمولیت سے محفوظ رکھا جائے یا ایسے کاموں سے بھی دور رکھا جائے جو ان کی صحت یا جسمانی، ذہنی، روحانی، اخلاقی یا سماجی ترقی کے لیے نقصان دہ ہوں۔

بچوں کے حقوق سے متعلق اقوام متحدہ کا معاہدہ

[آرٹیکل 32]

فریق ریاستیں اس عزم کا اظہار کرتی ہیں کہ وہ بچوں کو جنسی استحصال اور جنسی بدسلوکی یا زیادتی کی تمام شکلوں سے تحفظ فراہم کریں گی۔

بچوں کے حقوق سے متعلق اقوام متحدہ کا معاہدہ

اس سال نئی حلف اٹھانے والی حکومت پاکستان میں بچوں کے حقوق کی بحالی کے حوالے سے کئی وعدے اور عزم لے کر آئی۔ وزارت انسانی حقوق نے قانون سازی، عدالتی اصلاحات، آگہی میں اضافے، اور دیگر عملی اقدامات کے ذریعے ملک میں بچوں کے حقوق کی صورتحال میں بہتری کے عزم کا اعادہ کیا۔ حکومت نے بچوں کے ساتھ جنسی زیادتی اور بچوں کی فروخت جیسے مسائل پر قابو پانے کے لیے بین الاقوامی تعاون بڑھانے کی خواہش کا بھی اظہار کیا۔ دسمبر 2018 میں، قومی اسمبلی نے ایک قرارداد منظور کرتے ہوئے بچوں کے حقوق کے تحفظ اور فروغ، غذائیت میں کمی کے خاتمے اور نومولود بچے کے پہلے 1000 دنوں کے دوران بہتر نگہداشت کے اپنے عزم کو دہرایا۔

مجموعی طور پر، 2018 میں پاکستان اپنے بچوں کے تحفظ میں ناکام رہا اور ان کے تقریباً تمام بنیادی حقوق اور آزادیوں کی خلاف ورزی کی گئی یا انہیں خلاف ورزی کے شدید خطرے سے دوچار کیا گیا۔ نوزائیدہ بچوں کی نگہداشت کی کمی، پیدائش کے اندراج کی کم شرح، غذائی عدم تحفظ، حد سے زیادہ تشدد اور ناکافی قانونی و سماجی تحفظ، پرخطر مشقت، اور کم عمری کی شادی ایسے مسائل تھے جن کا پاکستانی بچوں کو مسلسل سامنا رہا۔ اگرچہ عدلیہ اور قانون نافذ کرنے والے ادارے بچوں کے خلاف جرائم کے مقدمات کی بھرپور طریقے سے پیروی کر رہے تھے تاہم بچوں کے خلاف تشدد کی شدت میں کوئی خاص بہتری نظر نہیں آئی۔

صحت

زندہ رہنے اور صحت مندانہ طور پر نشوونما پانے اور اعلیٰ معیار کی نگہداشت صحت کا حق ایک بنیادی انسانی حق ہے لیکن پاکستان میں بچوں کو اکثر اس سے محروم رکھا جاتا ہے، جس کی کئی وجوہات ہیں، جن میں غذائی عدم تحفظ، آلودہ پانی، صحت وصفائی کا ناقص نظام، اور صحت کی ناکافی سہولیات شامل ہیں۔ اس سال کے دوران سندھ کے ضلع تھرپارکر میں غذائیت میں کمی کا شدید بحران، بلوچستان میں غذائیت کی ہنگامی صورتحال، بچوں کی نشوونما میں رکاوٹ کی بڑھتی ہوئی شرح، اور قابل انسداد بیماریوں کی وجہ سے نومولود بچوں کی شرح اموات میں اضافہ ہوا۔

تھر، سندھ میں یکم جنوری 2018 سے 31 دسمبر 2018 تک 638 بچے غذائیت کی کمی کے باعث ہلاک ہوئے

اقوام متحدہ کی جانب سے نومبر 2018 میں جاری کی گئی ایک رپورٹ ایشیا اور بحرالکاہل کے علاقوں میں غذائی تحفظ اور غذائیت' کے مطابق، پاکستان میں صرف چار فیصد بچوں کو کم سے کم قابلِ قبول خوراک ملتی ہے۔ نیشنل کمپلیمنٹری فیڈنگ اسیسمنٹ (این سی ایف اے) کی ایک ایسی ہی تحقیق جو وزارت نیشنل ہیلتھ سروسز نے ڈی ایف آئی ڈی اور یونیسف کے تعاون سے کی تھی، میں بھی یہ انکشاف کیا گیا کہ پاکستان میں چھ سے 23 ماہ کے صرف 13 فیصد بچوں کو کم سے کم قابلِ قبول خوراک ملتی ہے۔

اس سال غذائیت کی کمی ملک میں بچوں کی صحت کے لیے سب سے بڑا خطرہ بنا رہا اور سندھ اور بلوچستان سب سے زیادہ متاثرہ صوبے تھے۔ سندھ میں تھر کے علاقے میں، یکم جنوری سے 31 دسمبر 2018 کے عرصے کے دوران 638 بچے غذائیت کی کمی کی وجہ سے ہلاک ہوئے۔ یہ تعداد گزشتہ چار سالوں میں سب سے زیادہ ہے۔ محکمہ صحت سندھ کے مطابق، جون 2013 سے اب تک، تھرپارکر میں قحط کی وجہ سے 2363 بچے ہلاک ہو چکے ہیں۔ اس بحران پر قابو پانے کے لیے سندھ حکومت نے ضلع تھرپارکر میں 5000 خاندانوں کے لیے غذائیت پروگرام کے منصوبے شروع کرنے کا اعلان کیا، اور وزیراعلیٰ سندھ نے فوری امدادی کارروائی کے طور پر، ہر تعلقہ میں طبی کیمپ قائم کرنے کا حکم دیا۔ غذائیت کی کمی صرف تھرپارکر تک محدود نہیں تھی، بلکہ اکتوبر میں سندھ کے ماں اور بچے کی صحت اور غذائیت پروگرام کی جانب سے صوبے بھر میں ماں کے دودھ سے متعلق چلائی گئی مہم میں یہ بات سامنے آئی کہ سندھ کے دیگر علاقوں میں بھی غذائیت کی کمی کا شکار بچوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اس مہم کے دوران 5,386,037 بچوں کی سکریننگ کی گئی جن میں سے 240,845 غذائیت کی کمی کا شکار پائے گئے۔

غذائیت کی دیرینہ کمی بلوچستان میں بھی موجود تھی جس کا سبب طویل خشک سالی تھی۔ صوبائی حکومت کی جانب سے عالمی بینک اور یونیسیف کے اشتراک سے قائم کیے گئے بلوچستان غذائیت سیل کے مطابق، صوبے میں تقریباً 52 فیصد بچے غذائیت کی کمی کی وجہ سے افزائش میں رکاوٹ کا شکار تھے، 40 فیصد کم وزن تھے، اور 16 فیصد کو غذائیت کی شدید کمی کا سامنا تھا۔ علاوہ ازیں، قومی غذائیت سیل کی جانب سے کیے گئے ایک سروے کے مطابق، پانچ سال سے کم عمر 57 فیصد بچوں کو خون کی کمی کا سامنا تھا۔ یونیسیف اور بلوچستان حکومت کے محکمہ صحت کی جانب سے 3 سے 5 دسمبر تک کی گئی مشترکہ سکریننگ میں یہ بات سامنے آئی کہ کوئٹہ سے ملحقہ علاقوں میں چھ ماہ سے پانچ سال کی عمر کے 40 سے 65 فیصد بچوں کو غذائیت کی شدید کمی کا سامنا تھا۔ صوبائی وزیر صحت نے غذائیت کی کمی کے بحران پر قابو پانے کے لیے نومبر 2018 میں بلوچستان میں غذائیت ایمرجنسی کا اعلان کیا۔ انہوں نے غذائیت کی کمی پر قابو پانے کی مہم کو توسیع دینے کا اعلان کیا جو بلوچستان کے سات اضلاع میں پہلے سے جاری تھی۔ آنے والے مہینوں میں، بلوچستان حکومت نے حکومتی نمائندوں، سول سوسائٹی کے اراکین، اور خیراتی ایجنسیوں پر مشتمل ایک ٹاسک فورس بھی قائم کی تاکہ خشک سالی اور غذائیت کی کمی کے مسائل پر قابو پایا جاسکے۔

2018 کی عالمی غذائیت رپورٹ کے مطابق پاکستان ان تین ممالک میں سے ایک تھا جو دنیا بھر میں افزائش کی کمی کا شکار بچوں کا نصف بوجھ برداشت کرتے ہیں اور صرف پاکستان میں افزائش مین رکاوٹ کا شکار بچوں کی تعداد ایک کروڑ ساتھ لاکھ ہے۔ غربت کے علاوہ آلودہ پانی پینا غذائیت کی کمی کی سب سے بڑی وجہ ہے جو بچوں کی افزائش میں رکاوٹ اور پیچش کا سبب بنتا ہے۔ عالمی بینک کی نومبر 2018 میں جاری ہونے والی رپورٹ جب پانی ایک خطرہ بن جاتا ہے: پاکستان میں پانی کی ترسیل، حفظانِ صحت اور غربت کی صورتحال اور اس کے بچوں کی افزائش میں رکاوٹ پر اثرات' میں کہا گیا ہے کہ پاکستان میں کم از کم 38 فیصد بچے افزائش کی کمی کا شکار ہیں اور اس کی سب سے بڑی وجہ پینے کے صاف پانی کی قلت ہے جس کا سبب حفظان صحت اور گندے پانی کے نکاس کا ناقص نظام ہے۔ اسی سال کنسرن ورلڈ وائیڈ اور ویلٹ ہنگر ہلف کی جانب سے جاری کی گئی ایک اور رپورٹ میں یہ بات سامنے آئی کہ بچوں کا قد اور وزن نہ بڑھنے کی شرح جنوبی ایشیاء میں سب سے زیادہ ہے۔ پاکستان 119 ممالک میں سے 106 ویں نمبر پر اور چار اشاریوں جیسے کہ غذائیت کی کمی، وزن کا نہ بڑھنا، قد کا نہ بڑھنا، اور بچوں کی اموات کی بنیاد پر بھوک کے عالمی گوشوارے میں یہ 32.6 اسکور کے ساتھ دوسرے نمبر پر رہا۔

پاکستان میں نومولود بچوں کی شرح اموات بھی کافی زیادہ رہی۔ یونیسیف کی فروری 2018 میں جاری ہونے والی ایک رپورٹ ایوری چائلڈ الائیو' میں کہا گیا کہ پاکستان کی نومولود بچوں کی اموات کی شرح دنیا بھر میں بدترین ہے اور پیدائش کے وقت بچوں کے اموات کا امکان 22/1 ہے۔ قابل انسداد بیماریاں پاکستان میں بچوں کی اموات کی سب سے عام وجوہات ہیں۔ جان ہاپکنز یونیورسٹی اور سیو دی چلڈرن کے اندازوں کے مطابق، 2030 تک پاکستان میں 700,000 بچے نمونیا کی وجہ سے ہلاک ہوجائیں گے، جس سے پاکستان ان چار ممالک میں

پاکستان ان تین ممالک میں شامل ہے جہاں پولیو کی بیماری ابھی تک ختم نہیں ہوئی

شامل ہو جائے گا جو اس بیماری کی وجہ سے اموات کا سب سے زیادہ بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں۔ نومبر 2018 میں جاری ہونے والی اس تحقیق میں، اس بیماری کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے ویکسی نیشن کا دائرہ کار بڑھانے، سستی جراثیم کش ادویات کی فراہمی، اور بہتر خوراک جیسے اقدامات کی سفارش کی گئی۔

اس سال بھی پاکستان کو پولیو وائرس کے حوالے سے مشکلات کا سامنا رہا اور یہ اب بھی دنیا کے ان تین ممالک میں سے ایک ہے جہاں یہ بیماری موجود ہے۔ اگرچہ 2016 سے پولیو کے کیسز میں نمایاں کمی واقع ہوئی ہے تاہم پاکستان اب بھی پولیو سے مکمل پاک نہیں ہوا۔ 2018ء میں کل 12 کیسز رپورٹ ہوئے جن میں سے 4 کیسز صرف ستمبر میں سامنے آئے۔ 2017ء میں 8 کیسز رپورٹ ہوئے تھے۔ 12 کیسز میں سے آٹھ خیبر پختونخوا (باجوڑ میں 5، چارسدہ میں 1، ضلع خیبر میں 1 اور لکی مروت میں 1)، تین بلوچستان (ضلع دکی میں 3) اور ایک سندھ (گڈاپ ٹاؤن، کراچی) میں رپورٹ ہوا۔ آخری پولیو ویکسی نیشن مہم 10 دسمبر 2018ء کو شروع ہوئی تھی جس کا ہدف تین کروڑ ستاسی لاکھ بچوں کو پولیو کے قطرے پلانا تھا۔

خسرہ ایک اور بیماری ہے جس کے پھیلاؤ میں گزشتہ دو سالوں کے دوران شدید اضافہ ہوا ہے اور 2018ء میں اس میں مزید اضافہ ہوا جس کے باعث ملک کے ہزاروں بچے متاثر ہوئے۔ گزشتہ سال لیبارٹری سے تصدیق شدہ 6494 کیسز رپورٹ ہوئے۔ یہ تعداد 2016ء کے مقابلے میں دوگنے سے زیادہ ہے۔ عالمی ادارہ صحت کی خسرہ سے متعلق نومبر 2018ء کی تازہ ترین صورتحال کے مطابق اس سال پاکستان دنیا کے ان دس ممالک میں سے ایک تھا جہاں خسرہ کے سب سے زیادہ کیسز رپورٹ ہوئے۔ ڈبلیو ایچ او کے مطابق، پاکستان میں جنوری

سے نومبر 2018ء تک خسرے کے 3721 کیسز رپورٹ ہوئے۔ اس حساب سے ہر دس لاکھ میں سے 19.26 بچے اس مرض میں مبتلا ہیں۔ ملک میں خسرے کے پھیلاؤ پر قابو پانے کے لیے اکتوبر 2018ء میں ایک ملک گیر ویکسی نیشن مہم کے تحت ملک بھر میں تین کروڑ ستر لاکھ بچوں کو ویکسین دی گئی۔

قانون سازی سے متعلق پیش رفت اور بچوں کے تحفظ کا نظام

گزشتہ چند سالوں کے دوران ملک میں بچوں کے تحفظ کے فریم ورک کو مستحکم کرنے کے لیے قانون سازی کے حوالے سے نمایاں پیش رفت ہوئی ہے۔ تاہم، عمل درآمد کے مناسب نظام ہائے کار تشکیل دینے کے حوالے سے ریاست کے سست ردِعمل کی وجہ سے یہ قانونی تحفظات مؤثر ثابت نہیں ہو سکے۔ علاوہ ازیں، ملک میں صرف 33 فیصد پیدائشوں کا اندراج ہوتا ہے جس کی وجہ سے محض چند بچے تحفظ کے موجودہ نظام سے مستفید ہو پاتے ہیں۔

2018ء میں قانون سازی کے محاذ پر چند پیش رفتیں بھی دیکھنے میں آئیں۔ فروری 2018ء میں قومی اسمبلی نے دارالحکومت اسلام آباد بچوں کے تحفظ کا ایکٹ منظور کیا جسے 18 مئی 2018ء کو صدر کی منظوری حاصل ہوئی۔ یہ پہلا قانون ہے جس کا مقصد دارالحکومت میں بچوں کے تحفظ کے نظام کا قیام ہے، جس کی بدولت بچوں کو ہر قسم کے جسمانی یا ذہنی تشدد، چوٹ، بے التفاتی، ناروا سلوک، استحصال، اور زیادتی سے تحفظ فراہم کیا جا سکے گا۔ اس قانون کے نمایاں خدوخال میں بچوں کے تحفظ کا مشاورتی بورڈ 'اور بچوں کے تحفظ کے اداروں' کا قیام شامل ہے۔ یہ بورڈ اس بات کو یقینی بنانے کا ذمہ دار ہے کہ اس ایکٹ کے نفاذ کے لیے تمام ضروری اقدامات کیے جائیں جبکہ ادارہ تمام شکایات کا جائزہ لینے اور مدد کی فراہمی کے لیے متعلقہ اداروں سے رابطہ کرنے اور ریکارڈ برقرار رکھنے کا ذمہ دار ہے۔ سال کے آخر تک تحفظ کے ادارے یا مشاورتی بورڈ کے قیام کے حوالے سے کوئی پیش رفت نہیں ہوئی تھی۔

خیبر پختونخوا اسمبلی نے صوبے میں 2010ء کے بچوں کے تحفظ کے بل میں ترمیم کرتے ہوئے بچوں کے تحفظ، فلاح کا (ترمیمی) بل 2018ء منظور کیا۔ ترمیمی بل کا بنیادی مقصد چند موجودہ شقوں کے الفاظ کو تبدیل کرتے ہوئے اور ان شقوں کی وضاحت کرتے ہوئے موجودہ قانون کی زبان اور مطابقت کو بہتر بنانا ہے۔

بچوں کے حقوق سے متعلق قومی کمیشن کا ایکٹ 2017ء کو منظور ہوئے ایک سال کا عرصہ گزرنے کے باوجود کمیشن تاحال تشکیل نہیں دیا گیا تھا۔ کمیشن کو ملک میں بچوں کے حقوق کے فروغ اور تحفظ کی ذمہ داری سونپی گئی ہے اور یہ چھ ارکان پر مشتمل ہونا چاہئے جن میں چاروں صوبوں، دارالحکومت اسلام آباد اور سابق وفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقہ جات سے ایک ایک رکن لیا جائیگا۔ وزارت انسانی حقوق نے اپریل 2018ء میں کہا کہ ایکٹ کے نفاذ میں رکاوٹوں کا سامنا رہا کیونکہ متواتر یاددہانی کے باوجود صوبوں نے مطلوبہ نامزدگیاں نہیں کیں۔ وزارت نے یہ بھی کہا کہ قانون کے مماثل ضوابط تشکیل دیے جا چکے تھے اور انہیں صوبوں کی جانب سے کمیشن کے لیے نامزدگیاں موصول ہونے کے بعد منظوری کے لیے کابینہ کو بھیجا جائے گا۔

7-2006 میں وفاقی وزارت برائے انسانی حقوق کے تحت تشکیل دیے گئے بچوں کے تحفظ کے قومی مرکز نے اکتوبر میں آئندہ سال کے لیے اپنے لائحہ عمل کا اعلان کیا۔ 2019ء میں یہ بچوں کے تحفظ کے چار اہم شعبوں پر توجہ دینے کا ارادہ رکھتا ہے جن میں لاوارث بچے، بچوں کی بیگار، بچوں کے خلاف تشدد، شراکت داروں کے ساتھ تعاون، اور بچوں کے تحفظ سے متعلق آگہی شامل ہے۔ خصوصی پروگراموں میں اسلام آباد کی کچی آبادیوں میں بچوں کے حقوق کی کمیٹیوں کا قیام، دارالحکومت میں بچوں کی بیگار کے اہم مراکز کی نشاندہی کے لیے ایک سروے کا انعقاد، ضلعی انتظامیہ، پولیس، بار ایسوسی ایشن، سول سوسائٹی اور میڈیا کے ساتھ تعاون کو بہتر بنانا، اور بچوں کے تحفظ سے متعلق معلومات کے نظام کا قیام شامل ہے۔

اکتوبر میں، سندھ ہائی کورٹ نے محکمہ سماجی بہبود اور سندھ چائلڈ پروٹیکشن اتھارٹی کو حکم دیا کہ وہ ڈویژن کی سطح پر ترک کردہ بچوں اور مفلس بچوں کے لیے اصلاحی ادارے قائم کرے۔ عدالت نے ڈی جی سندھ چائلڈ پروٹیکشن اتھارٹی (ایس سی پی اے) کو بھی حکم دیا کہ وہ گزشتہ دو سالوں کے دوران مفلس بچوں کے حوالے سے کیے گئے اقدامات کا ریکارڈ مرتب کریں اور بتائیں کہ ایس سی پی اے کے سیکشن 10 کے تحت اتھارٹی اپنے فرائض کس حد تک انجام دے رہی تھی۔ سندھ ہائی کورٹ نے اس حکمنامے کے حوالے سے سہ ماہی عمل درآمد رپورٹس جمع کرانے کا بھی تقاضہ کیا اور سندھ ہائی کورٹ کی معائنہ کار ٹیم کے ایک رکن کو عملدرآمد یقینی بنانے کو کہا۔ یہ ہدایات ایک خاتون کی درخواست کی سماعت کے دوران دی گئی تھیں جو اپنی کم سن بیٹی کی تحویل کا مطالبہ کر رہی تھی۔

بچوں کے خلاف تشدد۔ بچوں سے زیادتی اور استحصال

2018ء میں بچوں کے خلاف تشدد میں کوئی کمی نہیں آئی اور انہیں بڑے پیمانے پر جسمانی اور جنسی استحصال کا نشانہ بنایا گیا۔ اگرچہ ہر صوبے نے بچوں کے تحفظ کے حوالے سے جامع قوانین تشکیل دے رکھے ہیں تاہم اس کے باوجود بہت کم متاثرین حفاظتی، نفسیاتی اور قانونی امداد حاصل کر سکے۔

سال کا آغاز قصور میں ایک آٹھ سالہ بچی زینب کے ساتھ بہیمانہ جنسی زیادتی سے ہوا جس کی نعش کچرے کے ڈھیر سے برآمد ہوئی۔ یہ کیس میڈیا کی توجہ کا مرکز بنا رہا اور پولیس کی مجرم کو گرفتار کرنے میں ناکامی کی وجہ سے بڑے پیمانے پر فسادات دیکھنے میں آئے۔ شدید عوامی دباؤ کے نتیجے میں ملزم عمران علی کو دو ہفتوں کے اندر گرفتار کر لیا گیا جسے بعد ازاں انسداد دہشت گردی کی ایک عدالت نے موت کی سزا سنائی۔ اس کی سزا کو لاہور لائی کورٹ اور سپریم کورٹ دونوں نے برقرار رکھا اور صدر پاکستان نے اس کی رحم کی اپیل مسترد کر دی۔ عمران علی کو 17 اکتوبر 2018ء کوٹ لکھپت جیل میں پھانسی دے دی گئی۔

اس واقعے کے نتیجے میں وفاقی محتسب نے ایک ٹاسک فورس قائم کی تاکہ ملک میں بچوں کے ساتھ زیادتی کی صورتحال کا تجزیہ کیا جا سکے۔ بعد ازاں، اکتوبر میں ٹاسک فورس کی جاری کردہ رپورٹ بچوں کے خلاف جنسی زیادتی کے مسائل اور ردعمل کا جائزہ' میں ملک میں بچوں کے خلاف بڑھتی ہوئی جنسی زیادتیوں پر قابو پانے کے لیے قلیل اور

زینب کے بہیمانہ ریپ اور قتل کو ذرائع ابلاغ میں بہت زیادہ توجہ ملی اور پولیس کے ایکشن نہ لینے پر مشتعل احتجاج ہوئے

طویل المدت اقدامات تجویز کیے گئے۔ ان اقدامات میں ون سٹاپ امدادی مراکز کا قیام بھی شامل تھا جو متاثرین اور ان کے خاندانوں کو ضلع اور تحصیل کی سطح پر طبی، ذہنی، نفسیاتی و سماجی اور قانونی امداد فراہم کریں گے اور اس عمل کا آغاز قصور سے ہوگا۔ اس کے علاوہ ضلع قصور کی سطح پر مجرموں، مشتبہ افراد اور ممکنہ مجرموں کے ڈیٹا بیس کا قیام بھی ان اقدامات کا حصہ تھا۔

ساحل نامی این جی او کی جانب سے سال کے وسط میں جاری کردہ رپورٹ ظالمانہ اعداد و شمار' کے مطابق، 2017ء کے پہلے چھ ماہ کے مقابلے میں اس سال اسی عرصہ کے دوران بچوں کے خلاف جنسی زیادتی کے واقعات بڑھ گئے اور لڑکوں کے خلاف جنسی زیادتی کے واقعات میں شدید اضافہ ہوا (امن و امان کی صورتحال ملاحظہ کریں)۔

وفاقی وزارت برائے انسانی حقوق نے ملک میں بچوں کے ساتھ زیادتی کے مسئلے کے حل کے لیے نومبر 2018ء میں ایک ایکشن پلان ترتیب دیا۔ قومی اسمبلی کی بچوں سے زیادتی سے متعلق خصوصی کمیٹی کو پیش کی گئی ایک دستاویز میں کہا گیا کہ یہ منصوبہ روک تھام، تحفظ، بحالی اور انضمام، اور شرکت جیسے معاملات پر توجہ دے گا۔ اس میں والدین اور اساتذہ کی ایسوسی ایشنوں کے ذریعے اسکول کی سطح پر تحفظ کمیٹیوں کا قیام، ملک بھر میں حساسیت اور معلومات سے متعلق مہمات چلانا، بچوں کے حوالے سے دوستانہ عدالتوں کا قیام، قانون نافذ کرنے والے اہلکاروں، اراکین پارلیمنٹ اور عدالتی عہدے داروں کی تربیت، بچوں کی بہبود اور ترقی سے متعلق قومی کمیشن (این سی سی ڈبلیو ڈی) کو مستحکم کرنا، اور بچوں سے زیادتی کے متاثرین کے لیے حوالگی نظام کا قیام جیسے متعدد عملی اقدامات شامل تھے۔

پاکستان میں ہر سال ہزاروں بچے لاپتا ہونے کے باوجود گمشدگی کے واقعات کی تحقیقات اور گمشدہ بچوں

کی بازیابی پر بہت کم توجہ دی گئی۔ جولائی 2018ء میں، بچوں کے تحفظ پر کام کرنے والی ایک این جی او، روشنی ریسرچ اینڈ ڈویلپمنٹ آرگنائزیشن کی جانب سے سپریم کورٹ میں ایک آئینی پٹیشن دائر کی گئی۔ اس پٹیشن میں عدالت پر زور دیا گیا کہ وہ وفاقی اور صوبائی حکومتوں کو حکم دے کہ وہ لاپتا بچوں کے کیسز کو قابل دست اندازی جرم قرار دے۔ بعدازاں ہونے والی سماعتوں میں عدالت کو بتایا گیا کہ 2018ء کے پہلے چھ ماہ کے دوران ملک کے مختلف حصوں، بالخصوص کراچی میں 30 بچے لاپتا ہوئے اور صرف کراچی میں ہر سال 5000 سے 6000 بچے لاپتا ہوتے ہیں۔ سپریم کورٹ نے دلائل سننے کے بعد وفاقی سیکریٹری داخلہ اور صوبوں کے محکمہ داخلہ اور چاروں صوبوں کے انسپکٹر جنرل پولیس کو حکم دیا کہ وہ تین ہفتوں کے اندر لاپتا بچوں سے متعلق رپورٹس جمع کرائیں۔ چھ سال پہلے، اسی این جی او نے ایسی ہی ایک پٹیشن سندھ ہائی کورٹ میں بھی دائر کی تھی۔ دسمبر 2018ء میں، عدالت نے حکم دیا کہ ایف آئی اے اور پولیس کو صوبے میں لاپتا بچوں کی بازیابی کے لیے مشترکہ کارروائی کرنی چاہئے۔ کیس کی 2018ء میں ہونے والی آخری سماعت میں سندھ ہائی کورٹ نے پولیس کو حکم دیا کہ وہ لاپتا بچوں کو بازیاب کرائے اور عدالت کو 17 جنوری 2019ء کو رپورٹ جمع کرائے۔ اس پٹیشن کے دائر کیے جانے سے اب تک، صوبوں کے سیکریٹریز داخلہ اور صوبوں کے انسپکٹر جنرل پولیس کو ایسے متعدد احکامات اور ہدایات دی جاچکی ہیں جن میں لاپتا بچوں کی بازیابی کے لیے اقدامات کرنے کو کہا گیا تھا لیکن حکومتی اقدامات کی رفتار کافی سست رہی۔

2018ء میں کراچی پولیس نے روشنی کے تعاون سے، لاپتا بچوں کے والدین کی سہولت کے لیے شہر کے تین پولیس اسٹیشنوں میں چائلڈ پروٹیکشن ریسپانس سینٹر (سی پی آر سی) بھی قائم کیے۔ دسمبر 2018ء تک ان سینٹروں میں 188 واقعات (نومولود بچوں سے لے کر 17 سال تک) کی اطلاعات موصول ہوئیں جن میں سے 164 بچوں کو بازیاب کرایا گیا اور دیگر مقدمات میں 20 ایف آئی آر درج کی گئیں۔ سندھ حکومت نے پاکستان ٹیلی کمیونی کیشن اتھارٹی کے تعاون سے بچوں کی ہیلپ لائن 1122 بھی شروع کی جس کا مقصد بچوں کے حقوق کی خلاف ورزیوں بشمول جنسی زیادتی، کم عمری کی شادی، اغواء، اور گمشدگی کی شکایات وصول کرنا تھا۔ محکمہ سماجی بہبود کو بھی ایک نوٹیفکیشن جاری کیا گیا کہ وہ بچوں کے تحفظ سے متعلق ضلعی کمیٹیاں تشکیل دے تاکہ اس بات کو یقینی بنایا جاسکے کہ یہ ہیلپ لائن فعال رہے۔ ہیلپ لائن کا مرکزی دفتر کراچی میں ہے اور ذیلی دفاتر ہر ضلعے میں قائم کیے جانے ہیں جن کی سربراہی ڈپٹی کمشنر کریں گے۔

سندھ کابینہ نے نومبر میں بچوں کی بیگار پر پابندی عائد کردی۔ اس نے محکمہ سماجی بہبود (ایس ڈبلیو ڈی) کو ہدایت کی کہ وہ بچوں کی بیگار کے حوالے سے ایک مہم شروع کرے اور سڑکوں پر بھیک مانگنے والے تمام بچوں کو رہائی دلائے اور انہیں محکمہ کے زیر انتظام چلڈرن ہومز میں پناہ دے۔ ضلعی انتظامیہ اور پولیس کو بھی ہدایت کی گئی کہ وہ کم عمر بھکاریوں کی نشاندہی اور امدادی آپریشنوں کی انجام دہی میں ایس ڈبلیو ڈی کی مدد کرے۔

اقوام متحدہ کی افراد کی سمگلنگ سے متعلق عالمی رپورٹ 2018ء کے مطابق، بچوں کی سمگلنگ جنوبی

ایشیا کے ایک اہم مسئلے کے طور پر ابھر کر سامنے آئی ہے جہاں سب سے زیادہ بچوں کو سمگل کیا جاتا ہے۔ رپورٹ نے پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش کی نشاندہی ایسے ممالک کے طور پر کی جہاں خطے میں سب سے زیادہ بچوں کو سمگل کیا جاتا ہے۔ رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا کہ ان بچوں کی تعداد دنیا بھر میں سمگل ہونے والے بچوں کا 30 فیصد ہے اور سمگل ہونے والی لڑکیوں کی تعداد لڑکوں سے کہیں زیادہ ہے۔

کم سن گھریلو ملازمین

گھروں میں بچوں کی ملازمت کی ممانعت کے لیے منظور کیے گئے قوانین کے باوجود، ان کی ایک بڑی تعداد اب بھی غیر اندراج شدہ ہے۔ دسمبر 2016ء میں کم سن ملازمہ طیبہ کے کیس نے ملک کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی۔ اپریل 2018ء میں، اسلام آباد ہائی کورٹ نے اپنی ملازمہ کو حبس بے جا میں رکھنے، جھاڑو گم جانے پر اس کا ہاتھ جلانے، اسے ایک ڈوئی سے مارنے، سٹور روم میں قید رکھنے، اور اسے سنگین نتائج کی دھمکیاں دینے پر ایک ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج اور ان کی اہلیہ کو ایک سال قید اور پچاس پچاس ہزار جرمانے کی سزا سنائی۔ ایک ہفتے کے بعد، اسلام آباد ہائی کورٹ کے ایک ڈویژن بنچ نے جج اور اس کی بیوی کی سنائی گئی ایک سال قید کی سزا معطل کر دی۔ طیبہ کے والدین نے اسلام آباد ہائی کورٹ کو بتایا کہ وہ مقدمے کی پیروی نہیں کرنا چاہتے۔ جون میں، اسلام آباد ہائی کورٹ نے ریاست کی جانب سے دائر کی گئی اپیل منظور کر لی اور قید کی سزا کو ایک سال سے بڑھا کر تین سال اور جرمانے کو بڑھا کر پانچ لاکھ روپے کر دیا۔ بنچ نے اس بات کا مشاہدہ کیا کہ فوجداری نظام انصاف معاشرے کے کمزور ترین افراد کو نظر انداز کیے جانے، غیر انسانی اور ناروا سلوک کی بدترین شکل سے تحفظ فراہم کرنے میں ناکام رہا تھا اور اس نے صرف میڈیا پر تشہیر اور بعد ازاں سپریم کورٹ کی جانب سے لیے گئے از خود نوٹس کے بعد کام شروع کیا۔

گجر پورہ میں اپنی 11 سالہ ملازمہ، سمیرا کو مبینہ طور پر تشدد کا نشانہ بنانے اور اسے ایک لوہے کے راڈ سے مارنے اور جلانے پر ایک جوڑے کو گرفتار کر لیا گیا۔

ایک اور 11 سالہ لڑکی کنزا کو اس کے مالکان ایک خاتون آرمی افسر اور اس کا ڈاکٹر شوہر نے ایک کندآلے کی مدد سے تشدد کا نشانہ بنایا۔ شوہر کو نومبر میں اس کی عبوری ضمانت کی معیاد ختم ہونے پر گرفتار کر لیا گیا۔ اس کی بیوی، جو مقدمے کی مرکزی ملزم تھی، سے فوج کے حکام پہلے ہی تحقیقات کر رہے تھے۔

کام پر دیر سے پہنچنے پر مالک نے سات سالہ ہادیہ کو گولی مار کر قتل اور اس کی چھ سالہ بہن صفیہ کو زخمی کر دیا۔ واقعہ صوبہ خیبر پختونخوا کے علاقہ لکی مروت میں پیش آیا۔

یہ صرف چند واقعات ہیں جو اس وقت حکام اور میڈیا کی توجہ کا باعث بنتے ہیں جب پڑوسی ان کو اطلاع دیتے ہیں یا والدین شکایت کرتے ہیں۔ تاہم اکثر اوقات، والدین جو اپنے بچوں کو غربت کی وجہ سے کام کی غرض سے باہر بھیجتے ہیں ان کو پیسے کا لالچ دے کر خاموش رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔

کنزہ کو اس کے مالکان: ایک خاتون آرمی آفیسر اور ان کے خاوند (پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر) نے تشدد کا نشانہ بنایا

جسمانی سزا (تعلیم ملاحظہ کریں)

بچوں کا نظام انصاف (جیلیں اور قیدی بھی ملاحظہ کریں)

بچوں کے نظام انصاف کا آرڈیننس 2000 کی جگہ اس سال مئی میں بچوں کے نظام انصاف کا ایکٹ 2018ء منظور کیا گیا۔ نئے قانون کی ایک اہم خصوصیت متبادل نظام کا آپشن متعارف کرایا جانا ہے جو کہ نوعمر بچوں کے مقدمات کے تصفیے کا ایک راستہ ہے۔ یہ نظام رسمی عدالتی کارروائیوں سے رجوع کیے بغیر کسی بچے کی سماجی، ثقافتی، معاشی، نفسیاتی، اور تعلیمی پس منظر کی بنیاد پر اس کی ذمہ داری اور اس کے ساتھ ہونے والے برتاؤ کا تعین کرنے کا ایک متبادل طریقہ کار ہے۔ اس نظام کی انجام دہی کے لیے قانون تجویز کرتا ہے کہ قانون کے نفاذ کے تین ماہ کے اندر سیکشن 10 کے تحت بچوں کے نظام انصاف کی کمیٹیاں (جے جے سی) تشکیل دی جائیں۔ یہ کمیٹیاں حراست کے دوران نوعمر بچوں کی فلاح اور سماجی انضمام کی نگرانی کی بھی ذمہ دار ہوں گی۔ تاہم سال کے آخر تک ایسی کمیٹیاں قائم نہیں کی گئی تھیں۔

قومی کمیشن برائے انسانی حقوق خیبر پختونخوا چیپٹر کی جانب سے کی گئی تحقیق میں یہ بات سامنے آئی کہ 18 سال سے کم عمر متعدد بچوں کو صوبے کے نوعمر بچوں کے نظام انصاف سے خارج کیا جا رہا تھا۔ یہ رپورٹ عدالتوں، جیلوں، استغاثہ اور آزمائشی مدت/ پیرول کے شعبوں، پولیس اکیڈمیوں، تھانوں، بار کونسلوں، پولیس آرڈر 2002ء کے تحت کام کرنے والی کمیٹیوں، بچوں اور خواتین کی پناہ گاہوں، اور تنازعات کے تصفیے کی کونسلوں کے دوروں کے حقائق پر مبنی تھی۔ اس میں تجویز کیا گیا کہ نوعمر بچوں کے نظام انصاف کو بین الاقوامی اور قومی معیارات سے ہم آہنگ کرنے کے لیے ضروری اقدامات کیے جائیں اور اگر کسی شخص کی عمر جرم کے ارتکاب کے وقت 18 سال سے کم ہو تو اس کے ساتھ ایک نوعمر کے طور پر برتاؤ کیا جائے۔

نوعمر بچوں کے مقدمات کے فوری تصفیے کے لیے سپریم کورٹ کے جسٹس قاضی فیض نے تمام ہائی کورٹس کے

رجسٹراروں، صوبوں اور دارالحکومت اسلام آباد کے پراسیکیوٹر جنرلز اور اٹارنی جنرل پاکستان کو ستمبر 2018ء میں چند سفارشات پیش کیں۔ انہوں نے اپنی سفارشات میں کہا کہ نوعمر مجرموں کی جانب سے دائر کی گئیں اپیلوں کو ترجیح دی جانی چاہئے اور یہ کہ نوعمر بچوں کی عدالتوں کو چاہئے کہ وہ نوعمر بچوں کے مقدمات کو صرف غیر معمولی حالات میں ملتوی کریں۔ انہوں نے سپریم کورٹ کے دفتر کو بھی ہدایت کی کہ وہ نوعمر مجرموں کی تمام فوجداری پٹیشنوں اور اپیلوں کے فائل کے سرورق پر نوعمر بچہ' کا لفظ تحریر کرے اور ان مقدمات کو فوری طور پر نمٹائے۔

خواتین کی جیلوں میں اپنی ماؤں کے ساتھ رہنے والے بچے جیلوں میں قید آبادی کا سب سے زیادہ نظر انداز کیا گیا حصہ ہیں، جنہیں پوشیدہ متاثرین' کہا جاتا ہے۔ پنجاب حکومت نے اس سال ایک مثبت اقدام کا اعلان کیا جو یہ تھا کہ یہ صوبے کی تمام ڈسٹرکٹ جیلوں میں مونٹیسری اسکول قائم کرنے کا ارادہ رکھتی تھی تاکہ صوبے کی تمام ڈسٹرکٹ جیلوں میں خواتین قیدیوں کے بچوں کو معیاری غیر رسمی تعلیم فراہم کی جاسکے۔ یہ ادارے تین سے چھ سال کی عمر کے بچوں کو تعلیم فراہم کریں گے۔ ایسا پہلا اسکول نومبر 2018ء میں ڈسٹرکٹ جیل گوجرانوالہ میں کھولا گیا۔

معذوری کا شکار بچے (معذوری کا شکار افراد اور بچے ملاحظہ کریں)

کم عمری کی شادی

'پاکستان میں کم عمری کی شادی کے حوالے سے سزا سے استثنا کا خاتمہ: معیار اور عمل درآمد سے متعلق خامیاں' کے عنوان سے شائع ہونے والی رپورٹ کے مطابق، پاکستان دنیا کے ان ممالک میں چھٹے نمبر پر ہے جہاں کم عمری کی شادی کی شرح سب سے زیادہ ہے اور جہاں 21 فیصد لڑکیوں کی 18 سال کی عمر میں شادی کردی جاتی ہے۔ یہ رپورٹ ایک عالمی ایڈووکیسی گروپ، مرکز برائے تولیدی حقوق (سی آر آر) نے تیار کی تھی اور ستمبر میں کراچی میں شائع ہوئی تھی۔ رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا کہ کم عمری کی شادی لڑکوں کی نسبت لڑکیوں کو زیادہ متاثر کرتی ہے کیونکہ یہ انہیں گھریلو تشدد اور تولیدی صحت کے مسائل سے دوچار کرتی ہے۔ رپورٹ میں سفارش کی گئی کہ کم عمری کی شادیوں کو کالعدم قرار دیا جائے، ان عہدے داروں، بشمول پولیس اور مجسٹریٹس پر جرمانے عائد کیے جائیں جو انسدادی یا حفاظتی اقدامات کرنے میں ناکام رہیں، اور کم عمری کی شادیوں کے متاثرین کو قانونی اور دیگر خدمات تک آسان رسائی مہیا کی جائے۔

پشاور میں خواتین، لڑکیوں اور خواجہ سرا برادری کے حقوق پر کام کرنے والی ایک تنظیم بلیو ویینز نے 2018ء میں خیبر پختونخوا میں کم عمری کی شادی سے متعلق ایک تحقیق کی جس میں کم عمری کی شادی کے حوالے سے کمیونٹی کے تصورات کی چھان بین کی گئی۔ اس تحقیق میں خیبر پختونخوا کے کے سات اضلاع جیسے کہ پشاور، مردان، مانسہرہ، شانگلہ، بنوں، سوات اور ڈیرہ اسماعیل خان کی مختلف برادریوں کا احاطہ کیا گیا۔ تحقیق کا بنیادی مشاہدہ یہ تھا کہ لڑکیوں کی کم عمری کی شادیوں کی سب سے بڑی وجہ غربت ہے کیونکہ ان کے خاندان انہیں بوجھ سمجھتے ہیں اور ان کا یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ گھر کی آمدن میں حصہ نہیں ڈال سکتیں۔ اگرچہ برادری کے زیادہ تر افراد جن کا انٹرویو کیا گیا اس سرگرمی کے خطرات

کمسنی کی شادیوں کے پیچھے بنیادی محرک غربت ہے کیونکہ والدین اپنی بچیوں کو گھر کی آمدنی میں حصہ دار کی بجائے بوجھ سمجھتے ہیں

سے واقف تھے تاہم وہ غربت اور محرومی کی وجہ سے اپنے بچوں کی کم عمر میں شادی کرنے پر مجبور تھے۔

قومی کمیشن برائے انسانی حقوق (این سی ایچ آر) نے بھی پاکستان میں رہنے والی اقلیتی برادریوں میں جبری کم عمری کی شادی کی بڑھتی ہوئی تعداد پر شدید تشویش کا اظہار کیا۔ اس سال اکتوبر میں، این سی ایچ آر کے ایک عہدے دار نے بتایا کہ کمیشن کو جبری شادیوں کی متعدد شکایات موصول ہوئیں۔ این سی ایچ آر کے چیئرمین نے ان کیسز میں ایک سخت قانونی فریم ورک اور عمر کے تعین کے ایک باقاعدہ طریقہ کار اپنانے پر زور دیا۔

صنف پر مبنی تشدد کے خلاف فعالیت کے 16 دن کے دوران، ضلع تھرپارکر کے علاقے مٹھی کے دورے پر انڈر سیکریٹری جنرل اور اقوام متحدہ کی خاتون ایگزیکٹیو ڈائریکٹر نے رہائشیوں پر زور دیا کہ وہ مشترکہ اقدامات کے ذریعے کم عمری کی شادیوں کا خاتمہ کریں اور علاقے کو کم عمری کی شادی سے پاک کریں۔ اس سال کے شروع میں، ایک مجسٹریٹ نے ایک 14 سالہ ہندو لڑکی کو 55 سالہ شخص سے شادی پر مجبور کرنے پر چار افراد کو دو سال قید اور جرمانے کی سزا سنائی۔

دسمبر 2018ء میں رکن سینیٹ شیریں رحمان نے کم عمری کی شادی کی ممانعت کا (ترمیمی) بل سینیٹ میں پیش کیا جسے مزید غور و خوض کے لیے ایوان کی متعلقہ کمیٹی کو بھیج دیا گیا۔ بل میں کم سن کی تعریف ایک ایسے فرد کے طور پر کی گئی ہے جس کی عمر 18 سال سے کم ہو اور اس میں کسی کم سن سے شادی کرنے والے فرد کے لیے 20 لاکھ روپے جرمانے کے علاوہ تین سال قید بامشقت کی تجویز دی گئی ہے۔ وفاقی وزیر برائے پارلیمانی امور نے قید بامشقت کی

سزا کی مخالفت کی اور کہا کہ بل سے متعلق اسلامی نظریاتی کونسل سے مشاورت کی جانی چاہئے۔

اس سال کم عمری کی شادی کی ممانعت کا ایک بل بلوچستان اسمبلی میں بھی پیش کیا گیا لیکن اس سے پہلے کہ یہ منظور ہوتا، اسمبلی کی مدت ختم ہوگئی۔ بلوچستان عوامی پارٹی کے ایک رکن نے اکتوبر میں نئی حکومت پر زور دیا کہ وہ وہ بل کو قانون سازی کے لیے صوبائی اسمبلی میں پیش کرے کیونکہ کم عمری کی شادی صوبے کے بچوں کے لیے ایک بڑھتا ہوا خطرہ ہے۔

سفارشات

☆ مؤثر اور قابل رسائی نظام ہائے کار پر عمل درآمد کرتے ہوئے پیدائش کے اندراج کی شرح میں نمایاں بہتری لائی جائے۔ اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ تمام ریاستی پالیسیاں موجودہ کم عمر آبادی کی عکاس ہیں، ہر بچے کی قومی ڈیٹا بیس میں شمولیت ناگزیر ہے۔

☆ ملک اور خاص طور پر سندھ اور بلوچستان میں بڑھتے ہوئے غذائی عدم تحفظ اور اس کے نتیجے میں پیش آنے والی غذائیت کی کمی پر قابو پانے کے لیے مؤثر اور بروقت نظام ہائے کار متعارف کرائے جائیں۔

☆ پولیو کے خاتمے کے لیے صحت کی سہولیات، ویکسی نیشن اور صحت سے متعلق آگہی کے پروگراموں کا دائرہ وسیع کیا جائے اور خسرہ اور دیگر قابل انسداد بیماریوں کے پھیلاؤ کو روکا جائے جن سے ہر سال ہزاروں بچے متاثر ہوتے ہیں۔

☆ بچوں کے حقوق سے متعلق ایک قومی کمیشن فوری طور پر تشکیل دیا جائے تاکہ ایک ایسی مرکزی باڈی موجود ہو جو ملک میں بچوں کے حقوق کے نفاذ کی نگرانی کرے۔

☆ قوانین کے سخت نفاذ کو یقینی بنایا جائے تاکہ اس سماجی قبولیت پر قابو پایا جاسکے جو کم عمری کی شادی اور جسمانی سزا جیسی سرگرمیوں کو دوام بخشتی ہے۔

☆ پاکستان بھر میں لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے لیے شادی کی قانونی طور پر جائز عمر 18 سال مقرر کی جائے۔ سندھ کے علاوہ، تمام صوبوں کے قابل اطلاق قوانین میں لڑکیوں کی شادی کی عمر لڑکوں سے کم ہے۔

☆ بچوں کے ساتھ جنسی زیادتی اور بچوں کے اغواء کی روک تھام کے لیے ایک جامع پالیسی بنائی جائے اور ایسے کیسز کی تحقیقات اور مقدمہ بازی کے لیے مناسب طریق ہائے کار تشکیل دیے جائیں۔ اس بات کو بھی تسلیم کیا جائے کہ لڑکوں کو بھی جنسی زیادتی اور تشدد کے خطرے کا اتنا ہی سامنا ہے جتنا لڑکیوں کو ہے۔

محروم طبقوں کے حقوق

محنت کش

غلامی نہ تو موجود ہے اور نہ اس کی اجازت ہے۔ کوئی بھی قانون کسی بھی شکل میں، پاکستان میں اس کی اجازت فراہم نہیں کرے گا اور نہ ہی اسے پاکستان میں متعارف کرانے کی کوشش کرے گا۔ ہر قسم کی جبری مشقت اور انسانوں کی تجارت پر پابندی عائد ہے۔ چودہ سال سے کم عمر کے کسی بھی بچے کو کسی فیکٹری یا کان یا کسی دوسرے خطرناک پیشے میں ملازم نہیں رکھا جائے گا۔

آئین پاکستان

[آرٹیکل-11(3-1)]

ہر شہری کو تنظیم سازی اور یونین سازی کا حق حاصل ہوگا۔ سوائے اس کے کہ، پاکستان کے اقتدار اعلیٰ اور سا لمیت کے مفاد میں، یا امن عامہ اور اخلاق کے تحفظ کے لیے قانون کے تحت معقول پابندیاں عائد کی جائیں۔

آئین پاکستان

[آرٹیکل- 17 (1)]

ریاست منصفانہ اور مشفقانہ شرائط کار متعارف کرانے کی پابند ہوگی۔

آئین پاکستان

[آرٹیکل-37]

ریاست جنس، ذات، رنگ اور نسل سے بالاتر ہو کر عوام کی فلاح و بہبود کو یقینی بنائے گی اور دولت کے ارتکاز اور تقسیم اور پیداوار کے ذرائع کو، چند ہاتھوں میں سمٹنے سے روک کر، عوام کا معیار زندگی بہتر بنائے گی۔ ریاست، آجر اور ملازم، جاگیردار اور مزارع کے حقوق کے درمیان منصفانہ توازن قائم کرنے کی کوشش کرے گی اور ملک کے وسائل کے مطابق تمام شہریوں کو کام اور روزگار اور آرام کے مناسب مواقع سے روشناس کرائے گی اور ان کی تفریح کے لیے مواقع کی فراہمی کو بھی یقینی بنائے گی۔ ریاست، حکومت پاکستان کی ملازمت یا دوسرے اداروں میں خدمات سرانجام دینے والے تمام افراد کو لازمی بیمہ یا دیگر ذرائع سے سماجی تحفظ فراہم کرے گی اور جنس، ذات، رنگ اور نسل سے بالاتر ہو کر ان تمام افراد کو ضروریات زندگی مثلاً خوراک، لباس، رہائش، تعلیم اور طبی سہولیات فراہم کرے گی جو بے روزگاری، بیماری یا معذوری کی بنا پر مستقل یا عارضی طور پر روزی کمانے کے قابل نہیں۔۔۔ اور افراد کی آمدنیوں کے درمیان پائے جانے والے تفاوت کو کم کرنے کی کوشش کرے گی۔

آئین پاکستان

[آرٹیکل-38الف(ہ)]

کسی بھی شخص کو نہ تو غلام بنایا جائے گا نہ اس سے بیگار لی جائے گی۔

انسانی حقوق کا عالمی اعلامیہ، دفعہ 4

معاشرے کے رکن کی حیثیت سے ہر شخص کو معاشرتی تحفظ کا حق حاصل ہے۔

انسانی حقوق کا عالمی اعلامیہ، دفعہ 22

ہر شخص کو کام کاج، روزگار کے آزادانہ انتخاب، کام کاج کی مناسب و معقول شرائط اور بے روزگاری کے خلاف تحفظ کا حق حاصل ہے۔ ہر شخص کو کسی تفریق کے بغیر کام کی نوعیت کے مطابق معاوضہ حاصل کرنے کا حق ہے۔

کام کرنے والا ہر شخص ایسے مناسب و معقول مشاہرے کا حق دار ہے جو اس کے اور اس کے اہل وعیال کے لیے باعزت زندگی کا ضامن ہو اور جس میں اگر ضروری ہو تو معاشرتی تحفظ کے دوسرے ذریعوں سے اضافہ کیا جا سکے۔ ہر شخص کو اپنے مفاد کے تحفظ کے لئے انجمن سازی کرنے اور کسی بھی انجمن میں شامل ہونے کا حق حاصل ہے۔

شق 23(4-1)

ہر شخص کو آرام اور فرصت کا حق ہے جس میں کام کے وقت کا تعین اور تنخواہ کے ساتھ مقررہ وقفوں پر تعطیلات بھی شامل ہیں۔

شق 24

ہر شخص کو اپنی اور اپنے اہل وعیال کی صحت اور فلاح و بہبود کے لیے مناسب معیار زندگی کا حق حاصل ہے اس میں خوراک، پوشاک، مکان اور علاج کی سہولتیں اور دوسری ضروری معاشرتی مراعات، اور بیروزگاری، بیماری، معذوری، بیوگی، بڑھاپے اور ان حالات میں روزگار سے محرومی جو اس فرد کے قبضہء قدرت سے باہر ہوں، کے خلاف تحفظ کا حق حاصل ہے۔ **شق 25(1)**

بچوں کے حقوق کا عالمی کنونشن آرٹیکل (32 (1

یہ عام انتخابات کا سال تھا جس میں تین حکومتوں نے حکمرانی کی۔ برسر اقتدار حکومت نے مئی میں اپنی پانچ سالہ مدت پوری کی، ایک نگران حکومت نے انتخابات کے دنوں میں اقتدار سنبھالا، اور اگست کے وسط میں ایک نئی حکومت اقتدار میں آئی۔ سیاسی تبدیلی کے اس وقت میں، محنت کش تمام حکومتوں میں سے کسی کی بھی ترجیحات میں شامل نہیں تھے۔

مجموعی طور پر، 2018 میں محنت کشوں کی زندگی میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آئی۔ وہ اب بھی مشکل حالات میں کام کر رہے تھے اور زیادہ تر کام کی مناسب جگہوں، سوشل سکیورٹی اور بنیادی حقوق سے محروم تھے، اور بڑھتی ہوئی مہنگائی اور قیمتوں میں اضافے کے باوجود کم تنخواہ پر کام کر رہے تھے۔ 15 اگست کے بعد نئی حکومت کی جانب سے کیے گئے مشکل معاشی فیصلوں کے نتیجے میں پاکستانی روپے کی قدر کم ہوگئی اور بنیادی ضروریات زندگی، جیسے کہ گیس، بجلی اور پٹرولیم مصنوعات کے نرخ بڑھ گئے۔

محنت کشوں کو ایک اور دھچکا اس وقت لگا جب سپریم کورٹ کے حکم پر بڑے شہری مراکز میں تجاوزات کے خلاف مہم کا آغاز ہوا۔ اس کے نتیجے میں ہزاروں محنت کش اپنی ملازمتوں سے محروم ہوگئے اور اس سے کہیں زیادہ دکانوں کی مسماری کے بعد اب بھی بے روزگار تھے۔ کراچی کے محنت کش سب سے زیادہ متاثر ہوئے کیونکہ قبضے کی زمینوں پر واقع دکانیں اور مارکیٹیں مقامی حکومت کے حکام نے مسمار کر دی تھیں۔ دکان مالکان کا دعویٰ تھا کہ ان کی دکانیں قانونی تھیں اور ان میں سے زیادہ تر کئی سالوں سے کراچی میونسپل کارپوریشن کو کرایہ ادا کر رہے تھے۔ اگرچہ حکومت نے متبادل دکانیں مہیا کرنے کا وعدہ کیا تھا، تاہم ملازمین، جن میں سے زیادہ تر یومیہ اجرت کی بنیاد پر کام

تجاوزات کے خلاف آپریشن کے نتیجے میں کئی لوگوں کا روزگار ختم ہوا

کر رہے تھے، کو کسی قسم کا ریلیف نہیں دیا گیا۔

اس سال ایک مرتبہ پھر، وفاقی ادارہ شماریات نے سالانہ افرادی قوت سروے کی رپورٹ شائع نہیں کی، باوجود اس حقیت کے کہ یہ پہلے ہی 2017 میں مردم شماری کا عمل مکمل کر چکا تھا۔ آخری افرادی قوت سروے رپورٹ 15-2014 میں جاری کی گئی تھی۔

تجارتی معاشیات نامی پورٹل کے مطابق، 2016 میں پاکستان کی افرادی قوت کی تعداد پانچ کروڑ، 85 لاکھ، 30 ہزار تھی جو 2017 میں چھ کروڑ، 22 لاکھ، 30 ہزار تک پہنچ گئی۔ البتہ عالمی بینک کے اعداد و شمار کے مطابق 2016 میں پاکستان کی افرادی قوت چھ کروڑ، 83 لاکھ، 96 ہزار تھی جو 2017 میں بڑھ کر چھ کروڑ، 99 لاکھ، 57 ہزار ہو گئی۔

پاکستان میں کام کی جگہوں پر پیشہ ورانہ تحفظ اور صحت کی صورتحال میں کوئی بہتری نہیں آئی۔ سندھ اور پنجاب کے بڑے صنعتی مراکز میں صنعتی حادثات کی اطلاعات موصول ہوتی رہیں، اور ہلاک اور زخمی ہونے کے واقعات زیادہ تر سیلنڈر یا بوائلر پھٹنے کے باعث پیش آئے۔ بلوچستان میں کانوں میں گیس دھماکوں یا کانوں کے دھنسنے کے باعث متعدد مزدور ہلاک ہوئے۔

سیاسی وعدے

تمام بڑی سیاسی جماعتوں نے 2018 کے انتخابی منشور میں محنت کشوں اور ان کی فلاح سے متعلق پالیسیوں کا واضح طور پر ذکر کیا تھا۔ پاکستان پیپلز پارٹی (پی پی پی) نے اپنے گزشتہ چار ادوار حکومت کے دوران لیبر

قوانین متعارف کرائے تھے اور پی پی پی کے 2018 کے انتخابی منشور میں محنت کشوں کی معاونت سے متعلق اقدامات، جیسے کہ کم از کم اجرت کی بجائے گزارے کے مطابق اجرت، صوبائی سوشل سکیورٹی سروسز کی ہمہ گیریت، اور ایمپلائز اولڈ ایج بینیفٹ (ای او بی آئی) کے تحت پنشن کی سہولیات شامل تھیں۔

اسی طرح پی ٹی آئی کے انتخابی منشور میں ایک کروڑ نئی نوکریاں دینے، نوجوانوں کو ایسے تجارتی ہنر کی تربیت کی فراہمی جس کی مارکیٹ میں طلب ہو، سماجی تحفظ اور صحت کی خدمات کا دائرہ کار تمام شہریوں تک بڑھانے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ چونکہ پی ٹی آئی نے مرکز اور تین صوبوں میں حکومت بنا رکھی ہے، اسے اپنے ان وعدوں کو پورا کرنے کے لیے بہت زیادہ کام کرنے کی ضرورت ہے جو اس نے انتخابات کے وقت اپنی پانچ سالہ مدت کے لیے کیے تھے۔

سندھ میں، پی پی پی نے صوبائی حکومت بنائی اور لیبر اب ایک صوبائی موضوع ہے، لہٰذا اسے اپنے تمام انتخابی وعدوں پر عمل درآمد کرنا ہوگا۔ اپنے گزشتہ دور حکومت میں سندھ کی پی پی پی حکومت نے محنت کشوں کے لیے چند مثبت اقدامات کیے جن میں سے ایک محنت کشوں سے متعلق ریکارڈ قانون سازی تھی۔ تاریخ کی پہلی صوبائی سہ فریقی لیبر کانفرنس دسمبر 2017 میں منعقد ہوئی جس کے نتیجے میں ایک سہ فریقی قائمہ کمیٹی برائے لیبر قائم ہوئی جس میں ملازمین اور مالکان دونوں کو مساوی نمائندگی دی گئی۔ اسے 2018 کے دوران سندھ حکومت کا ایک اور مثبت اقدام قرار دیا گیا کیونکہ اس نے 2018 کے شروع میں ایک مزدور دوست پالیسی کا اعلان کیا تھا۔ تاہم لیبر قوانین کا نفاذ اور مؤثر لیبر معائنے کا فقدان سندھ کی صوبائی حکومت کے لیے اب بھی بہت بڑا چیلنج ہے۔

سندھ کے بعد پنجاب اور خیبر پختونخوا کی حکومتوں نے بھی 2018 میں اپنی متعلقہ صوبائی لیبر پالیسیاں متعارف کرائیں۔ بلوچستان نے تاحال اپنی لیبر پالیسی کا اعلان نہیں کیا، باوجود اس حقیقت کے کہ اس نے 2016 میں ایک پالیسی کی تیاری پر کام شروع کر دیا تھا۔

کم از کم اجرت

اٹھارہویں ترمیم کے بعد، صوبائی حکومتیں ہر سال کم از کم اجرت کے قانون (ہر صوبے میں علیحدہ قانون ہے) کے تحت غیر ہنرمند ملازمین کے لیے کم از کم اجرت کا اعلان کرنے کی پابند ہیں۔ عمومی طور پر، کم از کم اجرت کا اعلان بجٹ کے وقت کیا جاتا ہے، لیکن سابق حکومت نے وفاقی یا صوبائی سطح پر اس کا اعلان نہیں کیا تھا۔ انتخابات کے بعد، صرف سندھ حکومت نے غیر ہنرمند ملازمین کے لیے کم از کم اجرت کا اعلان کیا، اور کم سے کم تنخواہ کو 15,000 روپے ماہانہ سے بڑھا کر 16,200 کر دی۔ دیگر تین صوبوں نے 15,000 روپے کی سابقہ رقم کو مسلسل دوسرے سال برقرار رکھا۔ کم از کم اجرت پر تاحال بہت کم عمل درآمد نظر آیا ہے۔

محنت کشوں کی مشکلات

2018 میں عالمی ادارہ برائے لیبر (آئی ایل او) پاکستان کی جانب سے شائع کی گئی ایک رپورٹ 'پاکستان میں ٹریڈ یونین سازی اور صنعتی تعلقات کا خاکہ —' کے اندازوں کے مطابق دسمبر 2016 میں 7,096

ٹریڈ یونین رجسٹرڈ تھیں۔ اس نے یہ بھی اندازہ لگایا کہ عین اسی وقت یونین سے غیر وابستہ افرادی قوت کی تعداد 1,414,160 تھی جبکہ ملک میں اجتماعی سودا کار ایجنٹوں کی تعداد 1,360 تھی۔

اگرچہ آئی ایل او کا اندازہ ہے کہ ٹریڈ یونینز سے منسلک افرادی قوت کا تناسب تقریباً 2.32 فیصد ہے تاہم آزاد ذرائع کا ماننا ہے کہ یہ تعداد 1 فیصد سے زیادہ نہیں ہے۔ پاکستان میں زیادہ تر ٹریڈ یونینز صرف رسمی شعبے میں موجود ہیں اور، اندازوں کے مطابق، غیر رسمی شعبے سے وابستہ صرف 15.5 فیصد افرادی قوت ٹریڈ یونینوں کے تحت منظم ہے۔

قانونی پابندیوں کے علاوہ نجی شعبے کے مالکان کی یونین مخالف سرگرمیاں پاکستان میں ٹریڈ یونینوں کے زوال کی بنیادی وجوہات ہیں۔ اس وقت، قابل ذکر ٹریڈ یونینوں میں سے زیادہ تر سرکاری شعبے کے اداروں جیسے کہ واپڈا، پی آئی اے، پاکستان اسٹیل ملز، سٹیٹ بینک آف پاکستان، نیشنل بنک آف پاکستان، اور پاکستان پوسٹ آفس میں موجود ہیں۔

1990 اور 2000 کی دہائی میں سرکاری شعبے کے صنعتی اور کمرشل یونٹوں، بالخصوص بڑے کمرشل بنکوں، اور صنعتوں جیسے کہ گھی اور سیمنٹ تیار کرنے والے یونٹوں، کی بڑے پیمانے پر نجکاری کے باعث ان شعبوں میں ٹریڈ یونینیں ختم ہو کر رہ گئی ہیں۔

دو اہم سرکاری اداروں، کے الیکٹرک (سابق کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن) اور پاکستان ٹیلی کام (پی ٹی سی ایل) کی نجکاری نے ٹریڈ یونینوں کو مزید کمزور کر دیا ہے کیونکہ ان دونوں سرکاری شعبوں میں ملازمین کی بہت بڑی تعداد ٹریڈ یونینوں سے وابستہ تھی۔ ملازمت کے نئے طریقہ کار کے تحت ملازمین کی ایک بڑی تعداد اپنی ملازمتوں سے محروم ہوگئی۔ تیسرے فریق کے ملازمتی نظام، جس میں پرائیویٹ ٹھیکیدار ملازمین کو کسی خاص کمپنی میں یومیہ اجرت یا پیس ریٹ کی بنیاد پر بھرتی کرتا ہے، متعارف کرائے جانے کی وجہ سے ٹھیکے کی ملازمت کی صورتحال مزید سنگین ہوگئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ملازمین اس کمپنی کے ملازم نہیں ہوتے جس کی وہ مصنوعات تیار کر رہے ہوتے ہیں اور انہیں اس کمپنی کے ایمپلائمنٹ لیٹر یا شناختی کارڈ فراہم نہیں کیے جاتے، باوجود اس حقیقت کے کہ کئی کیسز میں وہ عمارتوں میں کام کرنے جاتے ہیں۔ تیسرے فریق کی ٹھیکے کی ملازمت کا طریقہ کار پاکستان میں اب بہت سی صنعتوں اور کمرشل اداروں نے اپنا لیا ہے، جس نے دراصل ملازمت کے منظر نامے کو تبدیل کر دیا ہے۔

دسمبر 2017 میں، سپریم کورٹ آف پاکستان نے ایک تاریخی فیصلے میں تیسرے فریق کی ملازمت کے نظام کو آئین اور بنیادی حقوق کے خلاف قرار دیا اور تمام مالکان کو حکم دیا کہ وہ ٹھیکے یا تیسرے فریق کے ٹھیکے پر بھرتی کیے گئے اپنے تمام ملازمین کو مستقل کریں۔

2018 کے دوران، اس حکم پر عمل درآمد کے لیے کوئی اقدامات نہیں کیے گئے۔ مزدوروں کے نمائندوں نے حکمنامے پر عمل درآمد کے لیے سپریم کورٹ میں ایک پٹیشن دائر کی، لیکن سپریم کورٹ نے ان کی پٹیشن کی سماعت کرنے سے انکار کر دیا، اور انہیں حکم دیا کہ وہ آرٹیکل 199 (ہائی کورٹ کا دائرہ اختیار) کے تحت کسی بھی ہائی کورٹ میں

پٹیشن دائر کریں۔

مرکزی ٹریڈ یونینز کے نمائندوں اور لیبر کے حوالے سے معاونت فراہم کرنے والی تنظیموں جیسے کہ پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف لیبر ایجوکیشن اینڈ ریسرچ (پائلر) نے ایک پٹیشن تیار کر لی ہے جسے وہ سندھ ہائی کورٹ میں جمع کرائیں گے۔

نئی حکومت نے ریاست کے زیر ملکیت تجارتی اداروں کی نجکاری کا عمل دوبارہ شروع کیا۔ لیبر اور ٹریڈ یونینز ہمیشہ سے ہی نجکاری کی مخالفت کرتے رہے ہیں کیونکہ اس کی وجہ سے بیروزگاری جنم لیتی ہے اور ریاست کی ملکیت ان یونٹس میں ہزاروں ملازمین اپنی ملازمتوں سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ماضی میں نجکاری کے باعث ریاست کے زیر ملکیت اداروں کے لاکھوں ملازمین اپنی ملازمتوں کے علاوہ دیگر مالی فوائد سے محروم ہو چکے ہیں۔

16 نومبر 2018 کو، وفاقی کابینہ نے سرمایہ پاکستان کمپنی (ایس پی سی) کے نام سے ایک ہولڈنگ ادارہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا جسے ملائشیا اور انڈونیشیا کے مالیاتی فنڈز کی طرز پر چلایا جانا تھا۔ حکومت ناقص کارکردگی کے حامل 195 یونٹوں کا کنٹرول خودمختار ایس پی سی کے حوالے کر دے گی تاکہ ریاست کی زیر ملکیت اداروں (ایس او ایز) پر اس کا اپنا اثر رسوخ ختم ہو سکے۔

سات کمپنیوں بشمول بینکوں اور پاور پلانٹس کی ابتدائی نجکاری کے لیے نشاندہی کی جا چکی ہے۔ 'سٹریٹیجک وجوہات' اور 'سماجی قدر و قیمت' کی وجہ سے تین بڑے اداروں پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز، پاکستان اسٹیل اور پاکستان ریلویز کی نجکاری نہیں کی جائے گی۔ ان کی تعمیر نو کی جائے گی تاکہ وہ مالی طور پر کارآمد ہو سکیں۔

فہرست میں بجلی تیار کرنے والے یونٹ، کنونشن سنٹر اسلام آباد اور دیگر شامل تھے۔ ایس پی ای نجکاری بمع مینجمنٹ کنٹرول کے لیے ایس ایم ای بینک میں 93.38 فیصد، پاکستان ری انشورنس کمپنی لمیٹڈ میں 44.8 فیصد اور اسٹیٹ لائف انشورنس کمپنی کے لیے 100 فیصد حصص فراہم کرے گی۔

اس کے علاوہ، درمیانی مدت میں، فرسٹ ویمن بینک کے 82.6 فیصد حصص بھی ایک نجی سٹریٹیجک شراکت دار کو دیے جائیں گے۔

حکومت کو واپڈا کے ملازمین کی یونینز کی جانب سے شدید مزاحمت کا سامنا ہے کیونکہ ملازمین نے جینکوز (بجلی تیار کرنے والی پاور کمپنیاں) اور ڈِسکوز (بجلی کی تقسیم کار کمپنیاں) کی نجکاری کی مخالفت کی ہے۔

سرکاری ملازمین

چاروں صوبوں کے شعبہ صحت سے وابستہ ملازمین، خاص طور پر لیڈی ہیلتھ ورکرز تنخواہوں میں اضافے اور ملازمتیں مستقل کیے جانے کے لیے جدوجہد کرتی رہیں۔

لیڈی ہیلتھ ورکرز (ایل ایچ ڈبلیوز) 2012 سے اپنی ملازمتیں مستقل کیے جانے اور واجبات کی ادائیگی کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ ایل ایچ ڈبلیوز کے خلاف تشدد جاری رہا، خاص طور پر خیبر پختونخوا اور سندھ میں پولیو کی مہمات کے

اکتوبر میں پی ٹی آئی کے اراکین پارلیمان نے پورٹ قاسم کے مزدوروں کے احتجاجی دھرنے میں شرکت کی۔
یہ ان کے دھرنے کا ستائیسواں روز تھا

دوران، جہاں والدین اپنے بچوں کو قطرے پلانے کی مزاحمت کرتے ہیں۔ ملک بھر میں، پولیو ورکرز کے خلاف ناروا سلوک، حملوں اور کچھ واقعات میں انہیں قتل کیے جانے کی کئی اطلاعات موصول ہوئیں۔

26 مئی 2018 کو، بہاول پور میں تنخواہوں کی عدم ادائیگی کے خلاف احتجاج کے دوران ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں مبینہ طور پر لوٹ مار کرنے اور عملے کو یرغمال بنانے پر تقریباً 800 لیڈی ہیلتھ ورکرز کے خلاف مقدمہ درج کر لیا گیا۔ ہیلتھ ورکرز یونین (ایچ ڈبلیو یو) پنجاب کے صدر نے مذاکرات کے بعد معاملہ حل ہونے کے باوجود ایل ایچ ڈبلیوز کے خلاف مقدمہ درج کرنے پر انتظامیہ کو تنقید کا نشانہ بنایا۔

پورٹ قاسم اتھارٹیز (پی کیو اے) کے ملازمین کی یونین نے ستمبر 2018 میں کراچی پریس کلب کے باہر دھرنا دیا۔ 31 دسمبر 2018 کو انہیں دھرنا دیے 98 دن گزر چکے تھے۔ بندرگاہ پر کام کرنے والے سینکڑوں ملازمین پی کیو اے اور ایک چینی کارگو کمپنی کے خلاف احتجاج کر رہے تھے، جو ان کے مطابق، ان کا استحصال کر رہے تھے اور جنہوں نے ان کی تنخواہیں روک رکھی تھیں۔ چینی کمپنی کا دعویٰ تھا کہ ملازمین کو پہلے ہی چھ ماہ کی تنخواہیں ادا کی جا چکی تھیں۔ ملازمین نے ڈاک ورکرز ایکٹ 1974 پر عمل درآمد کا مطالبہ کیا اور دھمکی دی کہ اگر وفاقی حکومت نے ان کے مطالبات کو پورا نہ کیا تو وہ اسلام آباد میں دھرنا دیں گے۔

اکتوبر 2018 میں، پاکستان کے محکمہ ڈاک کے ملازمین نے صحت اور رہائش سے متعلق فوائد کی بحالی کے لیے کوئٹہ میں ہڑتال کی۔ پاکستان میں محکمہ ڈاک کی تمام پانچ یونینوں نے اتحاد اور طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے صوبہ

بلوچستان میں ہڑتال کی۔ ملازمین نے شکایت کی کہ انہیں ان کا 'رہائشی الاونس'، جو ایک ایسی رقم ہے جو حکومت کم آمدنی والے افراد کی معاونت کے لیے فراہم کرتی ہے، نہیں دیا جا رہا، اور اس کے علاوہ ان کے میڈیکل بلوں کی ادائیگی بھی نہیں کی جا رہی۔

پی آئی ایکی انتظامیہ نے جولائی میں ایر لائن کی ملازمت کے تمام درجوں پر پاکستان لازمی خدمات (بحالی) ایکٹ (ای ایس اے) کا نفاذ کرتے ہوئے ملازمین کے مختلف حقوق بشمول ہڑتال پر جانے کے حق کو ختم کر دیا، جسے ملازمین نے مسترد کر دیا۔ ایسی ہی ایک پابندی 2016 میں بھی لگائی گئی تھی جب ملازمین، بشمول پائلٹ، اپنے حقوق کے لیے احتجاج کر رہے تھے۔

اس ایکٹ نے پی آئی اے سی ایل کے ملازمین پر ذمہ داریوں کی انجام دہی کے حوالے سے متعدد پابندیاں عائد کر دیں، جن کی خلاف ورزی نہ صرف کمپنی کے ضوابط کے تحت ایک ناشائستہ فعل ہے بلکہ یہ ایکٹ کے تحت جرم بھی ہے۔ یہ ایکٹ 9 جولائی سے نافذ العمل ہوا اور حکومت نے اعلان کیا کہ پاکستان لازمی خدمات ایکٹ 1952 چھ ماہ تک پی آئی اے سی ایل کی ملازمت کے تمام درجوں پر لاگو ہوگا۔ اگر کوئی شخص اس ایکٹ کی خلاف ورزی کا مرتکب پایا گیا تو وہ ایک سال قید تک کی سزا اور جرمانے کا مستوجب ہوگا۔

اسٹیل مل کے ملازمین

موجودہ حکومت نے پاکستان اسٹیل ملز کو نجکاری کی فہرست سے خارج کر دیا۔ تاہم، اسٹیل مل فعال نہیں ہے اور ہزاروں ملازمین کا مستقبل اب بھی غیر یقینی ہے۔ پاکستان کا سب سے بڑا صنعتی یونٹ، اسٹیل مل، جون 2015 سے بند ہے اور حکومت ملازمین کی تنخواہیں ادا کرنے سے قاصر ہے۔ وفاقی حکومت نے قومی احتساب بیورو (نیب) کو ایک خط لکھا ہے جس میں اس نے کہا ہے کہ اسٹیل مل کی بندش کے باعث 1.4 ارب روپے کا نقصان ہو رہا ہے جس کے نتیجے میں لوہا درآمد کرنے کی وجہ سے قیمتی زرِمبادلہ کا نقصان ہو رہا تھا۔ قومی اسمبلی کے ایک وفد نے جولائی 2017 میں حکومت سینیٹ کو ریفرنس بھیجنے کو کہا تھا۔

نجی شعبے کے ملازمین

نجی شعبے کے ملازمین موجودہ مالی صورتحال سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ ان کے کام کی جگہ کے حالات دردناک ہیں، جہاں پیشہ ورانہ صحت اور تحفظ کے معیارات کو عموماً نظرانداز کیا جاتا ہے۔ ریاستی نگرانی کے نظام کی غیر موجودگی یا اس کے مؤثر نہ ہونے کے نتیجے میں متعدد صنعتی حادثات پیش آئے ہیں جن میں سے زیادہ تر کی اطلاع نہیں دی گئی۔ سال بھر کے دوران، فیکٹریوں میں چھتیں گرنے، سلنڈر پھٹنے اور عمارت منہدم ہونے کی وجہ سے ہلاکتوں اور زخمی ہونے کی اطلاعات موصول ہوتی رہیں۔

گڈانی کے شپ بریکنگ یارڈ میں پیشہ ورانہ صحت اور تحفظ کی سہولیات تاحال مفقود ہیں۔ اکتوبر میں، یارڈ

پر کھڑے کیے گئے ایک ناکارہ بحری جہاز میں آگ بھڑک اٹھی جس کے نتیجے میں بحری جہاز میں کام کرنے والے 7 مزدور جھلس گئے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ اس سانحے سے محض ایک دن پہلے بلوچستان کے وزیر محنت نے یارڈ کا دورہ کیا تھا اور گڈانی بریکنگ کے ملازمین کے کام اور رہن سہن کے حالات کا جائزہ لیا تھا۔ حادثے کے بعد، بلوچستان حکومت نے علاقے میں جہاز توڑنے سے متعلق کسی بھی قسم کی سرگرمی اور ملازمین کے اجتماع پر پابندی عائد کردی۔

کانوں میں کام کرنے والے مزدور

بلوچستان اور دیگر صوبوں میں کانوں میں پیش آنے والے جان لیوا حادثات 2018 میں بھی پیش آتے رہے، جن میں متعدد مزدور اپنی زندگیوں سے محروم ہوگئے۔ لیبر رہنماؤں کے مطابق، کانوں میں کام کرنے والے مزدور اس لیے مر رہے ہیں کیونکہ حکومت اور مالکان کام کی جگہ پر صحت اور تحفظ کے معیارات متعارف کرانے میں ناکام ہے۔

ایک رپورٹ کے مطابق، گزشتہ آٹھ سالوں میں، بلوچستان میں کوئلے کی کانوں میں کام کرنے والے 318 سے زائد مزدور اپنی زندگیوں سے محروم ہو چکے ہیں۔ لیبر تنظیموں نے مطالبہ کیا ہے کہ حکومت کو آئی ایل او کے معاہدہ نمبر 176 کی توثیق کرنی چاہئے جس کا تعلق کانوں میں تحفظ اور صحت سے ہے۔ پاکستان اس اہم معاہدے کا فریق نہیں ہے۔

کان کنوں کی ہلاکتوں کی مسلسل اطلاعات انتہائی تشویش کا باعث ہیں۔ اپریل میں، قلات میں چھ کان کن دم گھٹنے سے جاں بحق ہوگئے۔ ضلع ڈکی میں، کوئلے کی ایک کان میں ہونے والے دھماکے کی نتیجے میں ایک کان کن

گذشتہ آٹھ برسوں کے دوران بلوچستان میں کوئلے کی کانوں میں 318 مزدور کام کے دوران ہلاک ہوئے ہیں

ہلاک اور تین زخمی ہوئے۔ مئی 2018 میں، بلوچستان میں پیش آنے والے دو مختلف حادثات میں 23 کان کن ہلاک ہوئے۔ مروار میں نجی طور پر چلائی جانے والی ایک کوئلے کی کان میں میتھلین گیس کے دھماکے کے باعث کان دھنس گئی جس کے نتیجے میں 16 مزدور جاں بحق ہوئے۔ پاکستان منرل ڈویلپمنٹ کارپوریشن کے زیر انتظام سورینج کول فیلڈ میں دھماکے کے نتیجے میں سات (7) مزدور جاں بحق ہوئے۔

مئی میں، صوبائی مائننگ اینڈ منرل ڈویلپمنٹ ڈیپارٹمنٹ نے کوئلے کی کانوں میں پیش آنے والے حادثات کی تحقیقات کے لیے ایک انجمن قائم کی اور قومی کمیشن برائے انسانی حقوق (این ایچ آر سی) نے کان کنوں کی حالت زار پر تشویش کا اظہار کیا۔

13 اگست کو پیش آنے والے ایک اور جان لیوا حادثے میں، کوئٹہ کے قریب واقع ایک کوئلے کی کان میں میتھین گیس کے دھماکے کے نتیجے میں کانوں میں کام کرنے والے کم از کم 18 مزدور جاں بحق ہو گئے۔ جاں بحق ہونے والوں میں دو امدادی کارکن بھی شامل تھے جو دھماکے کے بعد کان میں داخل ہوئے تھے۔ ستمبر میں، کوئٹہ کے قریبی علاقے سنجدی میں ایک کان میں زہریلی گیس بھر گئی جس کے نتیجے میں کوئلے کی کان میں کام کرنے والے چار (4) مزدور جاں بحق ہو گئے۔ اسی ماہ، کوہاٹ کے قریبی علاقے درہ آدم خیل میں، کوئلے کی ایک کان کی چھت منہدم ہو گئی جس کے نتیجے میں نو (9) کان کن ہلاک اور تین (3) زخمی ہوئے۔

کانوں میں ہونے والی اموات میں اضافے کے پیش نظر، ستمبر میں سپریم کورٹ نے بلوچستان اور خیبر پختونخوا کی حکومتوں سے کہا کہ وہ کانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی اموات سے متعلق جمع کرائی گئی پٹیشن پر جواب جمع کرائیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر دھماکے کانوں میں میتھین گیس بھر جانے کے باعث اس وقت رونما ہوتے ہیں جب مزدور کانوں میں داخل ہوتے ہیں۔ اس سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ اگر جان لیوا گیسوں کی جانچ کے ایک سادہ سے طریقہ کار کو اپنایا جاتا تو اموات پر کسی حد تک قابو پایا جا سکتا تھا۔

جدید غلامی

غلامی کے عالمی گوشوارے 2018 میں پاکستان آٹھویں نمبر پر ہے اور ایک اندازے کے مطابق تیس (30) لاکھ افراد جدید غلامی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ پاکستان ان چار ممالک میں سے بھی ایک تھا جس کا عدم تحفظ کے ماڈل میں اسکور 90 سے اوپر رہا۔ اس ماڈل میں منظم، انفرادی، اور ماحولیات خطرے اسباب کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ اس بات کا خاص طور پر ذکر کیا گیا کہ پاکستان جیسے ممالک میں، مسلح تنازعات سے متاثرہ علاقوں کا سروے نہیں کیا جا سکا، یہ اعداد و شمار محتاط اندازوں پر مبنی ہو سکتے ہیں۔ مسلح تنازعہ جدید غلامی کے لیے ایک نمایاں خطرہ سمجھا جاتا ہے اور قانون کی حکمرانی میں خلل، سماجی معاونت سے محرومی، اور تنازعے کی وجہ سے وقوع پذیر ہونے والی خلل انگیزی جیسے عوامل اس سے وابستہ ہوتے ہیں۔

پاکستان میں جدید غلامی کی عام شکلوں میں جبری اور گروی مشقت، انسانی سمگلنگ (بشمول مزدوروں کی سمگلنگ) اور گھریلو غلامی شامل ہیں۔

موجودہ قوانین پر عمل درآمد جدید غلامی کے خاتمے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ سابق پنجاب اسمبلی نے اپنے آخری اجلاس (16 مئی 2018) میں پنجاب گروی مشقت کے نظام (خاتمہ) (ترمیمی) کا بل 2018 کی منظوری دی، جو 1992 کے وفاقی قانون کی صوبائی شکل ہے۔ سندھ کی صوبائی اسمبلی نے پہلے ہی سندھ گروی مشقت کے نظام کے خاتمے کا ایکٹ 2015 منظور کر رکھا تھا۔ سندھ اور پنجاب دونوں ہی میں گروی مشقت کی شرح زیادہ ہے، خاص طور پر زراعت اور بھٹے کے شعبوں میں۔ گروی مشقت یا جدید غلامی دیگر کئی شعبوں جیسے کہ قالین بافی وغیرہ میں بھی موجود ہے۔

امریکی ڈپارٹمنٹ آف اسٹیٹ کی جانب سے جاری کی گئی 'افراد کی سمگلنگ رپورٹ 2018' ظاہر کرتی ہے کہ پنجاب وہ واحد صوبہ تھا جس نے گروی مشقت کے خلاف کی گئی قانونی کارروائی کو رپورٹ کیا، ماسوائے اسلام آباد جس نے صرف ایک تحقیقات کی اطلاع دی۔ پنجاب کے حکام نے اس عرصے کے دوران گروی مشقت کے حوالے سے 264 تحقیقات، 257 افراد کے خلاف قانونی کارروائی، 37 سمگلروں کو سزا دینے کی اطلاع دی۔ یہ تعداد گزشتہ سال کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ 2017 میں پنجاب نے پی پی سی کی دفعہ 369۔الف (انسانوں کی سمگلنگ) کے تحت 114 افراد کے خلاف تحقیقات، 112 کے خلاف قانونی کارروائی، اور 17 کو سزا دینے کی اطلاع دی تھی۔

اپریل میں، اطلاعات کے مطابق، سپریم کورٹ نے ایک پٹیشن کی سماعت کی جس میں بھٹہ مالکان کے ہاتھوں مزدوروں کے استحصال کو روکنے کے علاوہ باندی' (زندگی بھر کی غلامی) کی سرگرمی کے خاتمے کے لیے اقدامات کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ پٹیشن میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ بھٹہ مالکان مزدوروں کو اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ ان کے توسط سے لیبر یونینوں اور دیگر آئینی انجمنوں کی مداخلت کی درخواست کریں اور یہ کہ انہیں ان کے بنیادی حقوق سے محروم رکھا جا رہا تھا۔

گروی مشقت کے خلاف کارروائی کی خال خال اطلاعات موصول ہوئیں۔ 30 اپریل 2018 کو، لاہور پولیس نے آئی جی پنجاب کی جاری کردہ ہدایات کے بعد پنجاب بھر میں 29 بھٹہ مالکان اور منیجروں کو گرفتار کیا اور ان کے خلاف مقدمات درج کیے۔

پولیس کی ٹیموں نے صوبہ پنجاب میں معائنے کی غرض سے 847 بھٹوں کا دورہ کیا اور گروی مشقت کے الزام میں 29 افراد کو گرفتار کیا۔ ان میں 14 بھٹہ مالکان اور 15 منیجر شامل تھے۔

جنوری میں، لاہور ہائی کورٹ کے حکم پر ضلع اوکاڑہ کی تحصیل دیپالپور کے ایک بھٹے سے بچوں سمیت 13 زیر حراست مزدوروں کو بازیاب کرایا گیا۔

مارچ میں، میر پور خاص (سندھ) کے ایک فارم سے 19 گروی کسانوں کو بازیاب کرایا گیا۔ اس کے ایک ہفتے بعد، پولیس نے عدالت کے حکام پر سندھ کے علاقے دولت پور کے قریب ایک فارم پر چھاپہ مار کر 30 گروی مزدوروں کو آزاد کرایا۔

ضلع سیالکوٹ کے علاقے ڈسکہ میں، ایک مزدور کے خاندان کے 13 افراد، بشمول عورتوں اور بچوں، کو مبینہ طور پر دیگر بھٹوں کو فروخت کرنے پر ایک بھٹے کے تین مالکان کے خلاف مقدمہ درج کیا گیا۔ ان مزدوروں نے اجرت میں اضافے کا مطالبہ کیا تھا۔

غیر قانونی حراست اور جبری یا گروی مشقت کے دیگر کئی واقعات بھی منظر عام پر آئے، جن میں بعض اوقات مزدوروں کو زنجیروں میں باندھ کر رکھا گیا۔ مئی میں، میاں چنوں میں پیش آنے والے ایسے ہی ایک واقعے میں، میاں بیوی اور ان کی سات سالہ بیٹی کو ایک سال تک قید کر کے رکھا گیا اور ان سے جبری مشقت لی گئی، جنہیں بعد ازاں پولیس نے بازیاب کرالیا۔

بچوں کی مشقت

ملک میں بچوں کی مشقت کی سنگین صورتحال میں کوئی بہتری دکھائی نہیں دی۔ ایک اندازے کے مطابق، ملک میں ایک کروڑ بیس لاکھ بچے، زیادہ تر غربت کی وجہ سے، چائلڈ لیبر کا شکار ہیں۔ پاکستان افرادی قوت سروے 15-2014 کے مطابق، ان میں سے 10 سے 14 سال کی عمر کے 61 فیصد بچے لڑکے تھے اور 88 فیصد دیہی علاقوں سے آئے تھے۔ بچوں کے تعداد سے متعلق اندازے کبھی بھی درست نہیں ہو سکتے کیونکہ چھوٹے غیر اندراج شدہ یا خاندانی کاروباروں یا گھریلو ملازمت میں کام کرنے والے بچوں کو سروے کا حصہ نہیں بنایا جاتا۔

فروری میں، سابق پنجاب انتظامیہ نے بھٹوں پر بچوں کی مشقت کے خاتمے کے لیے ایک مہم شروع کرنے کا اعلان کیا۔ اس کے بعد، اطلاعات کے مطابق، سیالکوٹ میں 32 بچوں کو آزاد کرایا گیا اور مالکان کو گرفتار کیا گیا۔

اپریل میں، سماجی کارکنوں نے پنجاب حکومت کے 'گروی مشقت کے خاتمے کے مربوط پراجیکٹ' کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کرنے کا مطالبہ کیا۔ حکومت نے بظاہر اس منصوبے کے لیے 5 ارب دس کروڑ روپے مختص کیے تھے اور 88,000 بچوں کو بھٹوں سے ہٹانے اور دیگر شعبوں میں تقریباً 41,000 بچوں کو چائلڈ لیبر سے آزاد کرانے کا دعویٰ کیا تھا۔ تاہم، سماجی کارکن اور بھٹہ مزدوروں کے ساتھ کام کرنے والے لوگوں کا کہنا تھا کہ اسکول خالی تھے اور بچے اب بھی کام کر رہے تھے۔ ضلع شیخوپورہ میں، اطلاعات کے مطابق، اس پراجیکٹ کے تحت رسمی طور پر قائم کیے گئے ایک کمرے پر مشتمل 204 اسکول بند کر دیے گئے تھے۔

خیبر پختونخوا کی سابق کابینہ نے اپنے 24 مئی 2018 کو ہونے والے آخری اجلاس میں چائلڈ لیبر پالیسی کی منظوری دی تھی جو اس کے مطابق اپنی طرز کی پہلی پالیسی تھی۔ حکومت کا دعویٰ تھا کہ یہ بچوں کی مشقت کی

ملک میں ایک کروڑ، 20 لاکھ سے زائد بچے مشقت کر رہے ہیں

حوصلہ شکنی کرے گی اور بچوں کی مشقت کے ذمہ دار عوامل پر قابو پانے کے حوالے سے ایک ٹھوس حکمت عملی بنانے میں مدد دے گی۔

گھروں میں بچوں کی ملازمت کا سلسلہ جاری رہا۔ میڈیا میں ایسے واقعات صرف اس وقت سامنے آتے ہیں جب غفلت اور ناروا سلوک کے سنگین واقعات رپورٹ ہوتے ہیں۔

چاہے مالکان بے نقاب ہو جائیں اور ان کے خلاف قانونی کارروائی ہو بھی جائے، جس تواتر کے ساتھ ایسی خبریں منظر عام پر آتی ہیں اس سے ایک مرتبہ پھر اس بات کی عکاسی ہوتی ہے کہ بچوں کی مشقت کے خاتمے کے لیے صرف قوانین کافی نہیں بلکہ اصل مسئلہ قوانین کے نفاذ اور اقدامات کا ہے۔ بچوں کی مشقت کے حوالے سے ذہنیت اور رویوں کو تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ ایسا آگاہی کی ان مہمات کے ذریعے ہی ممکن ہوسکتا ہے جو ایک ایسے معاشرے میں اصلاحات لاتی ہیں جہاں والدین اور مالکان اپنی ضروریات کو بچے کی ضروریات سے مقدم رکھتے ہیں۔

گھر پر کام کرنے والے محنت کش

ہوم نیٹ پاکستان کے مطابق، جو گھر پر کام کرنے والے مزدوروں کا رکنیت پر مبنی نیٹ ورک ہے، ملک میں گھر پر کام کرنے والے ملازمین کی تعداد 2 کروڑ ہے جس میں سے ایک کروڑ بیس لاکھ خواتین ہیں۔

گھر پر کام کرنے والے ملازمین غیر منظم اور تحفظ سے محروم ہیں، انہیں 14 سے 16 گھنٹے کی شفٹوں میں تھکا دینے والے اور پر خطر کام کرنے پڑتے ہیں اور انہیں معاوضہ بھی بہت کم ملتا ہے۔ انہیں ٹھیکیداروں اور دلالوں پر

بھی انحصار کرنا پڑتا ہے جو ان کا استحصال کرتے ہیں۔

مئی میں، سندھ اسمبلی نے سندھ گھر پر کام کرنے والے ملازمین کا ایکٹ منظور کیا جو پاکستان میں گھر پر کام کرنے والے ملازمین کے حقوق کے تحفظ کا پہلا قانون ہے، جو گھر پر کام کرنے والے ملازمین کا اندراج کرے گا اور انہیں باضابطہ بنائے گا اور بیماری، زچگی کی چھٹی، چوٹ، یا موت کی صورت میں ان کے اور ان کے اہل خانہ کے ساتھ مساوی برتاؤ کو یقینی بنائے گا۔ کسی گھر کی حدود یا گھر کے قریب کسی مقام پر مصنوعات کی تیاری یا خدمات کی فراہمی میں مصروف تمام گھر پر کام کرنے والے ملازمین اس قانون سے مستفید ہوں گے۔ ضوابط کار ابھی تک تشکیل نہیں دیے گئے تھے۔ دیگر صوبوں نے اپنی نئی لیبر پالیسیوں میں گھر پر کام کرنے والے ملازمین کا ذکر تو کیا لیکن انہوں نے اس حوالے سے قانون سازی نہیں کی۔

کراچی میں گھر پر کام کرنے والی خواتین ملازمین نے دسمبر میں احتجاج کرتے ہوئے کام کی جگہ پر ہراسانی کے خاتمے اور اپنے مرد ہم منصبوں کے مساوی معاوضہ دینے کا مطالبہ کیا۔

بتایا گیا ہے کہ ہوم نیٹ پاکستان نے گھر پر کام کرنے والی خواتین ملازمین کے لیے ایک مالی خواندگی پروگرام متعارف کرایا تاکہ انہیں مارکیٹ پر مبنی تفاوت کی موجودہ صورتحال کے بارے میں آگہی فراہم کی جاسکے اور ان کے مالی علم اور خواندگی میں اضافہ کیا جاسکے۔

گھریلو ملازمین (خواتین اور بچے بھی ملاحظہ کریں)

ایک محتاط اندازے کے مطابق، پاکستان میں گھریلو ملازمین کی تعداد 80 لاکھ سے زیادہ ہے۔ ان میں سے زیادہ تر خواتین اور لڑکیاں ہیں جن کی محنت کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں، جس کی وجہ سے درست اعداد و شمار جمع کرنا ناممکن ہے۔ ان ملازمین کی ایک بڑی تعداد بچوں پر مشتمل ہے۔ مالکان کا برتاؤ اس وقت منظر عام پر آتا ہے جب میڈیا کی رپورٹس انتہائی ناروا سلوک کی نشاندہی کرتی ہیں اور عام لوگوں کے بیانات کام کے طویل اوقات، کام کے بوجھ، کم تنخواہ، آرام یا رخصت کی غیر موجودگی، چوری کے الزامات، اور جسمانی اور جنسی زیادتی کی نشاندہی کرتے ہیں۔

پنجاب گھریلو ملازمین بل دسمبر 2018 کے شروع میں پنجاب اسمبلی میں پیش کیا گیا۔ بتایا گیا ہے کہ ایسا ہی ایک بل وزارت انسانی حقوق میں تیاری کے مراحل میں تھا جسے پارلیمنٹ میں پیش کیا جانا تھا۔ پنجاب کے بل میں بالآخر ملک میں گھریلو ملازمین کی معاشی اور سماجی قدر و قیمت کو تسلیم کیا گیا ہے اور اس میں گھریلو ملازمین کے محنت کش طبقے میں سے خارج کیے جانے کے مسئلے کو حل کیا گیا اور ان کے سماجی تحفظ کی ضرورت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ تاہم، بل میں کچھ بے قاعدگیاں موجود ہیں جن پر تحفظات پائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر، کم از کم عمر 15 برس رکھی گئی ہے اور پرخطر کام کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔

ایک اندازے کے مطابق ملک میں گھریلو ملازمین کی تعداد 80 لاکھ سے زائد ہے

زرعی ملازمین

سال 2018 کا اختتام اوکاڑہ ملٹری فارمز کے ان مزارعین کے لیے مثبت خبریں لے کر آیا جو اس زمین کے ملکیتی حقوق کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں جن پر وہ کئی عشروں سے کاشتکاری کر رہے ہیں۔ قومی کمیشن برائے انسانی حقوق (این ایچ سی آر) نے معاملے میں مداخلت کی اور فوج نے کمیشن کے سامنے تسلیم کیا کہ وہ اس زرعی زمین کے مالک نہیں ہیں بلکہ درحقیقت، یہ زمین حکومت پنجاب کی ملکیت ہے۔ این ایچ سی آر کے مطابق، اگرچہ مزارعین کو ملکیتی حقوق نہیں دیے جائیں گے، تاہم وہ مزید ہراسانی کے بغیر مزارعین یا بٹائی دار کے طور پر کام کرتے رہیں گے۔

عوامی ورکرز پارٹی کے مطابق، کسانوں کی اس تحریک کے دوران، گزشتہ چند سالوں میں، کم از کم 13 مزارعین جاں بحق ہو چکے ہیں، اور تقریباً 1,900 مزارع جیلوں میں قید ہیں جن میں 200 سے زائد خواتین شامل ہیں۔ کسانوں کی ایسوسی ایشن، انجمن مزارعین پنجاب (اے ایم پی) کے تین مرکزی رہنما اب بھی جیل میں ہیں۔

اے ایم پی کے خلاف بہیمانہ مظالم کے باوجود، صرف دس فیصد مزارعین نے پٹے پر کاشتکاری کا کرایہ دینے پر رضامندی ظاہر کی ہے، 90 فیصد اب بھی مزاحمت کر رہے ہیں۔ پنجاب کے مختلف حصوں کے مزارعین سرکاری شعبے کے زرعی فارمز میں 68,000 ایکڑ سے زائد اراضی پر کاشتکاری کر رہے ہیں۔

سمندر پار مزدور

معاشی سروے 2017-18 کے مطابق، 90 لاکھ سے زائد پاکستانی دنیا بھر میں کام کر رہے ہیں، جن کی ایک بڑی تعداد، جو 54.80 فیصد ہے، مشرق وسطیٰ اور اس کے بعد یورپ (26.81 فیصد) اور امریکہ (11.90

فیصد) میں مقیم ہے۔ 2016 کے دوران، تقریباً 84 لاکھ کی افرادی قوت نے مختلف ممالک، بالخصوص سعودی عرب اور مشرق وسطیٰ کا رخ کیا جس سے ملک کی ترسیلات زر میں اضافہ ہوا۔

نومبر میں، وزارت سمندر پار پاکستانی و ترقیِ انسانی وسائل نے بیرون ملک رہنے والے پاکستانیوں کے لیے ایک آن لائن شکایت مرکز، کال سرزمین، اور ایک ای گورننس ویب پورٹل کا اغاز کیا۔

میڈیا ملازمین (اظہار رائے کی آزادی بھی ملاحظہ کریں)

2018 میڈیا ملازمین کے لیے بدترین سال رہا چونکہ بہت سے اخبارات اور ٹی وی چینلز کو بند کر دیا گیا اور باقی ماندہ میڈیا ہاؤسز نے سیکڑوں ملازمین کو برطرف کر دیا۔ میڈیا ملازمین کو ریاستی اور غیر ریاستی عناصر دونوں کی جانب سے خطرات کا سامنا رہا۔

میڈیا ملازمین کے خلاف تشدد کے واقعات میں 2018 میں اضافہ دیکھنے میں آیا۔ پاکستان پریس فاؤنڈیشن کی تیار کردہ رپورٹ 'پاکستانی میڈیا کی صورتحال 2018' کے مطابق، پاکستان میں کم از کم تین صحافی اپنی زندگیوں سے محروم ہو گئے۔ ان کی تحقیق ظاہر کرتی ہے کہ جسمانی حملوں کے کم از کم 22 واقعات پیش آئے جن میں پانچ صحافی زخمی ہوئے، جبکہ 25 دیگر صحافیوں کو تشدد اور دست اندازی کا نشانہ بنایا گیا تاکہ انہیں ان کی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کی انجام دہی سے روکا جا سکے۔

پی ایف یو جے کے مطابق، 2018 کے محض پہلے آٹھ ماہ کے دوران، مختلف میڈیا ہاؤسز سے تعلق رکھنے والے 500 سے زائد ملازمین اپنی ملازمتوں سے محروم ہوئے۔ گزشتہ سال کے دوران، میڈیا کی متعدد تنظیموں کو اشتہارات سے حاصل ہونے والے منافع میں کمی یا دیگر مالی پابندیوں کی وجہ سے اپنے عملے میں کمی کرنا پڑی یا کاروبار بند کرنا پڑا۔

میڈیا ملازمین کی انجمنیں، جیسے کہ فیڈرل یونین آف جرنلسٹس، تنخواہوں کی عدم ادائیگی اور میڈیا ملازمین کو برطرف کیے جانے کے خلاف احتجاج کرتی رہی ہیں۔ بہت سی میڈیا تنظیموں کے ملازمین کو کئی ماہ سے تنخواہیں نہیں ملی تھیں، جس سے ان کے مالی مسائل میں اضافہ ہوا۔ اکتوبر میں، پی ایف یو جے نے میڈیا ملازمین بڑے پیمانے پر میڈیا ملازمین کو برطرف کرنے کے خلاف ملک بھر میں احتجاج شروع کیا۔

پھر 15 دسمبر کو، ملک کے سب سے بڑے میڈیا ہاؤس، جنگ گروپ نے کئی سو ملازمین کو برطرف کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے کنید فاتر بند کر دیے۔

سفارشات

☆ لیبر سے متعلق آئی ایل او معاہدوں کے آٹھ مرکزی معیارات پر عمل درآمد کے لیے قوانین بنائے جائیں اور ان کا نفاذ کیا جائے۔ گھر پر کام کرنے والے مزدوروں سے متعلق کنونشن C177 اور گھریلو ملازمین سے متعلق کنونشن

189 کی توثیق کی جائے۔

☆ تمام صوبائی حکومتوں کو اس بات کا پابند کیا جائے کہ وہ اپنے بجٹ میں کم از کم اجرت کا اعلان کریں اور محنت کشوں کے لیے ایک معقول گزارے کے مطابق اجرت کی فراہمی کی جانب کام کریں۔

☆ تمام شہریوں کو سوشل سکیورٹی کی اسکیموں تک رسائی فراہم کی جائے جو ایک بنیادی حق ہے۔

☆ کام کی ہر جگہ بشمول کانوں میں پیشہ ورانہ تحفظ اور صحت کی سہولیات کی فراہمی کو یقینی بنایا جائے۔

☆ تربیت یافتہ معائنہ کاروں کی تعداد میں اضافہ کرتے ہوئے صوبائی سطح پر لیبر کے معائنے کے نظام کو مستحکم بنایا جائے۔ اندرون اور بیرون ملک ملازمین کے لیے تربیت کا انعقاد کرتے ہوئے لیبر معائنہ کاروں کی استعداد میں اضافہ کیا جائے۔

☆ آئی ایل او کے کنونشن 144 پر عمل درآمد کیا جائے اور تمام صوبوں میں ہر سال سہ فریقی مشاورتی اجلاس منعقد کیے جائیں، جیسے کہ سندھ میں منعقد کیے گئے۔

معمر افراد

قانون کی نظر میں تمام شہری برابر اور قانون کے مساوی تحفظ کے حق دار ہیں۔

آئین پاکستان
[آرٹیکل (1)25]

اس آرٹیکل میں مذکور کوئی امر حسب ذیل کے جواز پر اثر انداز نہیں ہوگا:
کوئی قانون جو حسب ذیل غرض کے لیے کسی قسم کی جائیداد کے حصول کی اجازت دیتا ہو۔۔۔۔
ان لوگوں کو نان نقفہ مہیا کرنے کے لیے جو بے روزگاری، بیماری، کمزوری یا ضعیف العمری کی بناء پر اپنی کفالت خود کرنے کے قابل نہ ہوں۔

آئین پاکستان

اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ، عالمی بزرگ افراد: 2017 کہتی ہے کہ دنیا بھر میں ساٹھ سال سے زیادہ عمر کے افراد کی تعداد اگلے چند سالوں میں ایک ارب سے بڑھنے اور 2050ء تک دو ارب دس کروڑ ہونے کی توقع ہے۔

پاکستان میں بزرگ شہریوں کی تعداد ایک کروڑ دس لاکھ ہے جو ملک کی کل آبادی کا تقریباً سات فیصد ہے اور اقوام متحدہ کے آبادی فنڈ کے اندازے کے مطابق 2050ء تک یہ تعداد چار کروڑ تیس لاکھ ہو جائے گی۔

مختلف خطوں میں بزرگ آبادی کا گرتی ہوئی شرح تولید اور عمر درازی کی بڑھتی ہوئی شرح سے براہ راست تعلق ہے جس کی وجہ طبی دخل اندازیاں ہیں۔ جیسے جیسے ملک ترقی کرتے ہیں اور معاشی سرگرمی میں اضافے کے لیے مزید افرادی قوت درکار ہوتی ہے، وہ کم بچے پیدا کرتے ہیں۔ بچے پیدا کرنے کی شرح میں کمی کا یہ سلسلہ بزرگ افراد کی تعداد میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔ اگرچہ زیادہ آمدن والے ممالک معمر افراد کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے پنشن، انشورنس، سماجی تحفظ، طبی نگہداشت، اور رہائش اور ٹرانسپورٹ کی سہولیات کی فراہمی کے ذریعے اپنی سماجی و معاشی پالیسیوں میں تبدیلیاں لانے میں کامیاب رہے ہیں، تاہم یہ ان ممالک کے لیے ایک بڑا چیلنج ہے جو پہلے ہی شدید غربت اور صحت کے ناقص بنیادی ڈھانچے کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔

معمر افراد کی جانب معاشی اور ثقافتی لحاظ سے کئی طرح کے ردعمل کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اگرچہ زیادہ آمدن والے ممالک میں زیادہ تر معمر افراد الگ رہتے ہیں، تاہم کم آمدن والے ممالک میں صرف 15 فیصد اکیلے رہتے ہیں۔

بچوں کے ساتھ مشترکہ رہائش کا تعلق غربت سے بھی ہے۔ پاکستان میں، 60 یا اس سے زائد عمر کے 90 فیصد بزرگ اپنے بچوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ اقوام متحدہ کی رپورٹ کے مطابق، معمر افراد، خاص طور پر خواتین جو بہر صورت دنیا بھر کی معمر آبادی کا تقریباً 60 فیصد ہیں کے تنہا رہنے کے امکانات بڑھ رہے ہیں۔

معمر افراد کے لیے پالیسیاں

1999ء میں حکومت نے معمر افراد کے لیے ایک پالیسی تشکیل دی جو طبی اور دانتوں کی نگہداشت، فزیوتھراپی، بوڑھوں کی بنیادی نگہداشت صحت کے حوالے سے ڈاکٹروں کی تربیت، اور مفلس معمر افراد کے لیے پناہ گاہوں کے قیام کا احاطہ کرتی تھی۔ اس پالیسی پر تاحال عمل درآمد نہیں ہوسکا۔ آئین کے تحت تمام شہریوں کو ملازمت کے حق، ایذا رسانی سے آزادی، اور عوامی مقامات تک رسائی سمیت تمام بنیادی حقوق کی ضمانت دی گئی ہے۔ تاہم معمر افراد کا خصوصی طور پر کوئی ذکر نہیں کیا گیا کیونکہ یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ گروہ آئین کے تحت اپنے تمام حقوق، آزادیوں اور مراعات سے مستفید ہوسکیں گے۔

2014ء میں خیبر پختونخوا معمر افراد ایکٹ منظور کیا گیا جس کے تحت 60 سال سے زائد عمر کے افراد کو سینیئر سٹیزن کارڈ جاری کیے جائیں گے اور وہ مفت علاج اور ادویات، اور لائبریریوں، پارکوں اور دیگر عوامی مقامات میں مفت داخلے کے مستحق ہوں گے۔ ایکٹ پر عمل درآمد کے لیے محکمہ سماجی بہبود کے تحت ایک کونسل قائم کی جانی تھی۔

جنوری 2018ء میں وزیر اعلیٰ نے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ ایکٹ کے حوالے سے کوئی پیش رفت نہیں ہوسکی تھی۔ انہوں نے محکمہ سماجی بہبود کو ہدایت کی کہ وہ ایکٹ کے تحت فراہم کیے گئے مراعاتی پیکیجوں پر عمل درآمد کے لیے حتمی مدت کا تعین کرے۔ اگلے ماہ محکمے نے بزرگ شہریوں سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنا اندراج کرائیں اور سینیئر سٹیزن کارڈ کے لیے درخواست دیں تاکہ وہ بنیادی سہولیات کے اہل ہوسکیں۔ ایک اخباری رپورٹ کے مطابق، خیبر پختونخوا کے محکمہ سماجی بہبود کے افسر برائے منصوبہ بندی نے کہا کہ ابتدائی طور پر چھ اضلاع میں سہولیات فراہم کی گئی تھیں، لیکن اب ان کا دائرہ پورے صوبے تک وسیع کیا جارہا ہے۔ ستمبر میں، لوگ اب بھی یہ شکایت کررہے تھے کہ ایکٹ پر عمل درآمد نہیں کیا گیا ہے۔ ایک این جی او کا کہنا ہے کہ چھ لاکھ سے زائد افراد نے کارڈ کے لیے درخواست دی مگر ایک بھی درخواست گزار کو کارڈ جاری نہیں کیا گیا۔ ایک اندازے کے مطابق خیبر پختونخوا میں 60 سال سے زائد عمر کے افراد کی تعداد دو کروڑ اسی لاکھ ہے۔

اسی طرح، بلوچستان بزرگ شہریوں کا ایکٹ 2017ء کی بھی ایک کونسل ہے جس کی سربراہی کوئی ممتاز بزرگ شہری کرے گا جس کا تقرر وزیر اعلیٰ کریں گے اور اس کا انتظام محکمہ سماجی بہبود کے تحت چلایا جائے گا۔ کونسل کے کارہائے منصبی میں معمر افراد کے لیے ایک پالیسی کی تشکیل، میڈیکل یونیورسٹیوں میں بزرگوں کے معالجے سے متعلق نصاب متعارف کرانا، بنکوں، ریلوے اسٹیشنوں اور ہسپتالوں میں سہولت کاری ڈیسک، اور علاج و معالجے کے لیے علیحدہ وارڈ اور رعائتیں شامل تھیں۔

تاہم یہ دونوں ایکٹ دیکھ بھال کرنے والوں کی طرف سے ناروا سلوک کی صورت میں بزرگ شہریوں کی شکایات کی تلافی نہیں کرتے۔

سندھ حکومت نے 2016ء میں معمر شہریوں کا ایکٹ منظور کیا جو کہیں زیادہ فوائد فراہم کرتا ہے جن میں ضلعی سطح تک سرکاری ہسپتالوں میں مفت علاج، نجی ہسپتالوں میں 25 فیصد رعائت نیز ٹرانسپورٹ میں 50 فیصد رعائت شامل ہے۔ یہ تمام سہولیات آزادی کارڈ کے ذریعے دستیاب ہوں گی۔ یہ کارڈ مقامی حکومت کی جانب سے جاری کیے جائیں گے۔ اس قانون میں معمر افراد کی جانب سے جائیداد کے دوبارہ حصول کا بھی انتظام کیا گیا ہے اور ایک عدالتی مجسٹریٹ کی جانب سے ایک جامع ٹرائل کے بعد ان لوگوں کے لیے سزا مقرر کی گئی ہے جو اپنے خاندان کے بزرگ افراد کو ترک کر دیتے ہیں۔

بتایا جاتا ہے کہ پنجاب حکومت نے ایک بل تیار کیا ہے جسے اسمبلی سے منظور کرایا جائے گا۔

صحت

معمر افراد میں بیماری اور معذوری کا بوجھ بہت زیادہ ہے جو 1998 کی مردم شماری میں 28 فیصد تک ریکارڈ کیا گیا تھا۔ اموات کی عام وجوہات میں دل کی بیماریاں، فالج، پھیپھڑوں کا دیرینہ مرض، الزیمرز، پھیپھڑوں کے انفیکشن، ذیابیطس، گردوں کی بیماریاں اور پھیپھڑوں، معدے اور چھاتی کا کینسر شامل ہیں۔ آغا خان یونیورسٹی کی 2006ء میں جاری ہونے والی ایک تحقیق، 'بوڑھے مریضوں کی صحت اور ضروریات کا جائزہ' میں یہ بات سامنے آئی کہ تھکان، چلنے پھرنے سے معذوری، سانس لینے میں دشواری، پیشاب پر قابو پانے میں ناکامی اور بصارت سے محرومی کے معمر افراد کی زندگی پر بدترین اثرات مرتب ہوئے، جبکہ ذیابیطس (28.1 فیصد)، ہائپرٹینشن (42.5 فیصد)، اور جوڑوں کی سوزش (26.6 فیصد) سب سے زیادہ تواتر کے ساتھ رپورٹ ہونے والے دیرینہ امراض تھے۔

کراچی میں 2013ء میں شائع ہونے والی ایک اور تحقیق، 'کراچی، پاکستان میں معمر افراد میں نفسیاتی دباؤ، بی ایم سی طب نفسیات' میں یہ بات سامنے آئی کہ نفسیاتی دباؤ کا پھیلاؤ 40.6 فیصد تھا اور یہ مرض مردوں (32 فیصد) کی نسبت خواتین (50 فیصد) میں غالب تھا۔ 12/1 خواتین کے مقابلے میں 4/1 سے کچھ زیادہ مرد برسر روزگار تھے۔ غیر رسمی تعلیم سے محروم خواتین (68 فیصد) کی تعداد مردوں (44 فیصد) سے زیادہ تھی۔ شریک حیات کے ساتھ نہ رہنے والے اور اپنے بچوں کو مستقبل کی ضمانت نہ سمجھنے والے معمر افراد کا نفسیاتی دباؤ سے متاثر ہونے کا زیادہ امکان ہوتا ہے۔ انہیں سماجی نقصانات کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ ان کی زندگیاں کام سے وابستہ تعلقات ختم ہو جانے، دوستوں، رشتے داروں یا شریک حیات کی موت، اور ایک محدود سماجی زندگی، جو نفسیاتی اور جذباتی خوشی کے لیے ناگزیر ہے، کے باعث محدود ہو کر رہ جاتی ہیں۔ تحقیق میں کہا گیا ہے کہ: زیادہ آمدن اور متوسط اور کم آمدن والے ممالک دونوں میں، معمر افراد میں نفسیاتی دباؤ کا بوجھ بہت زیادہ ہے اور معذوری کے ساتھ گزارے گئے سالوں میں

اس کا حصہ تقریباً 1/6 ہے۔

ستمبر 2018ء میں پنجاب کے وزیر صحت نے کہا کہ ملک میں پہلی دفعہ سرکاری ہسپتالوں میں معمر افراد کے لیے نگہداشت صحت کی خدمات شروع کی جائیں گی۔ الزیمرز پاکستان کی جانب سے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے اشتراک سے الزیمرز کے مرض اور اس سے متعلقہ ذہنی خلل پر منعقد کیے گئے ایک سیمینار کے موقع پر اپنے مرکزی خطاب میں وزیر صحت نے اس بات کا اعتراف کیا کہ ذہنی خلل کے مریضوں کی تعداد بڑھ رہی تھی اور اس سے متاثرہ مریضوں کو خاندان اور معاشرے دونوں کی جانب سے اضافی نگہداشت کی ضرورت تھی۔ وزیر صحت کے مطابق، صوبے میں جلد ہی ڈبلیو ایچ او کے منصوبے کی مطابقت میں ایک منصوبہ شروع کیا جائے گا جس میں بوڑھے مریضوں کے معالجے سے متعلق خدمات جیسے کہ ہسپتال کی سطح پر یادداشت کے کلینک، بروقت تشخیص اور علاج کے لیے وسائل کی گردش، اور دیکھ بھال کرنے والوں کے لیے نفسیاتی مسائل کے حل سے متعلق خدمات فراہم کی جائیں گی۔ اس حوالے سے عوامی اجلاسوں کا بھی انعقاد کیا جائے گا۔

رہائشی سہولیات

پاکستان میں معمر افراد کے لیے چند ایسی رہائشی سہولیات دستیاب ہیں جہاں ایسے ماہرین موجود ہیں جو معمر افراد کے معالجے کا مؤثر طور پر انتظام کر سکتے ہیں۔ پنجاب کے مختلف اضلاع میں معمر افراد کے لیے عافیت نامی سات پناہ گاہیں موجود ہیں جو حاجت مندوں کے لیے بلا معاوضہ ہیں۔ دیگر صوبائی حکومتوں نے ایسی کوئی پناہ گاہیں قائم نہیں کیں۔ کراچی کا کیتھولک چرچ بوڑھے لوگوں کے لیے تین پناہ گاہیں چلاتا ہے جن کا انتظام بنیادی طور پر چرچ کا عملہ

عافیت سنٹر ملتان میں عمر رسیدہ افراد

رضا کاروں کی مدد سے چلاتا ہے۔ سبسڈی پر چلنے والے ریٹائرمنٹ ہوم کی ایک اور مثال پارسی جنرل ہسپتال اور اس سے ملحقہ ہسپتال ہے۔ اگرچہ یہ اولڈ ہوم ضرورت مندوں کو محفوظ ٹھکانے فراہم کرتے ہیں تاہم ان کی تعداد بہت کم ہے اور ان مراکز میں بھی معمر افراد کے معالجے سے متعلق خصوصی معاونت درکار ہے۔

رہن سہن کے حالات

معمر افراد کی خوشحالی کے لیے گھر کے اندر جگہ، بجلی اور پانی کی دستیابی بھی نمایاں اہمیت کی حامل ہے۔ تنگ اور غیر صحت مند ماحول میں رہنے والے افراد میں بیماری، غذائیت کی کمی اور ورزش کے فقدان جیسے مسائل کا زیادہ سامنا رہتا ہے۔ پاکستان کی آبادی میں بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام کی مردم شماری: این ایس ای آر کا تجزیہ 12-2011 بی آئی ایس پی یونیسیف ظاہر کرتا ہے کہ بی آئی ایس پی کے دائرہ کار میں شامل 51.6 فیصد مرد اور 48.4 فیصد خواتین میں معذوری کا پھیلاؤ گھر کے نسبتاً کمزور افراد (طلاق یافتہ، بیوہ اور علیحدہ رہنے والے)، شادی شدہ اور کبھی نہ شادی کرنے والے افراد کے مقابلے میں نمایاں طور پر زیادہ ہے۔ معذوری کا پھیلاؤ بیواؤں میں سب سے زیادہ (7.9 فیصد) ہیا اور اس کے بعد علیحدگی اختیار کرنے والوں (5.7 فیصد)، طلاق یافتہ افراد (4.6 فیصد)، کبھی بھی شادی نہ کرنے والوں (2.1 فیصد) اور شادی شدہ افراد (1.9 فیصد) کا نمبر آتا ہے۔

بہت سے مسائل جیسے کہ گرنے کے واقعات اور حادثات جو معمر فرد کے معیار زندگی میں شدید گراوٹ کا باعث بنتے ہیں کو سوچ بچار اور احتیاط سے کام لیتے ہوئے حل کیا جاسکتا ہے، اور مناسب غذائیت بخش خوراک ذہنی صحت کو بہتر بنا سکتی ہے۔ آنکھوں کے باقاعدگی سے معائنے، سماعت کے ٹیسٹ، اور دانتوں کی حفاظت کے ذریعے شدید معذوری میں کمی اور قابو پایا جاسکتا ہے۔ عین اسی وقت، یہ بات قابل غور ہے کہ پاکستان میں رہنے والے معمر افراد عام طور پر ایسی زندگی گزارتے ہیں جس میں جسمانی محنت کا بہت کم عمل دخل ہوتا ہے جس کا نتیجہ پٹھوں کے حجم میں کمی کی صورت میں نکلتا ہے جو گرنے کے واقعات اور حادثات کا سبب بنتا ہے۔ دنیا بھر میں، یہ تجویز کیا جاتا ہے کہ معمر افراد کو جسمانی اور سماجی طور پر فعال رہنا چاہئے۔

خاندانوں کی امداد

معمر افراد کا معالجہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر پاکستان کی یونیورسٹیوں بالخصوص انڈر گریجوایٹ سطح پر، اور نرسوں، فزیکل تھراپسٹس اور دیگر ماہرین صحت کے لیے زیادہ توجہ نہیں دی جاتی۔ 2010ء میں ایس آر سبزواری اور جی اظہر کی جانب سے کی گئی ایک تحقیق پاکستان کے معمر افراد—ایک نیا چیلنج' میں کمیونٹی کے ساتھ مشغولیت کی تجویز دی گئی ہے تاکہ عام بیماریوں کو سمجھنے اور ان کی بروقت تشخیص اور علاج میں خاندانوں کی مدد کی جاسکے نیز رضا کارانہ پروگراموں جیسے کہ جز وقتی تدریس، خیراتی کاموں، اور اُن پروگراموں کے ذریعے معمر افراد کے معاشرے میں دوبارہ انضمام کو یقینی بنایا جاسکے جن میں معمر افراد دیگر بزرگوں کی مدد کرسکیں۔ 2012ء میں سبینہ جلال اور ایم زیڈ یونس کی

جانب سے کی گئی ایک اور تحقیق پاکستان کے بزرگ اور معمر افراد' میں تجویز دی گئی ہے کہ کمیونٹی ہیلتھ کے تربیت یافتہ کارکن گھروں کے دورے کریں اور مقامی حکومتیں اور خیراتی تنظیمیں معمر افراد کو غذائیت کے اعتبار سے ایسے متوازن کھانے مہیا کریں جن پر سبسڈی دی گئی ہو۔ اسی طرح، دوا خانے ادویات کے لیے کال اور ڈیلیوری سروس مہیا کر سکتے ہیں تا کہ معمر افراد کو اپنے ادویات کے معمولات کی باقاعدگی سے پیروی کرنے کے قابل بنایا جا سکے۔

وسیع خاندانوں میں رہنے والے معمر افراد کا معیار زندگی علیحدہ رہنے والوں سے نمایاں طور پر بہتر ہوتا ہے۔ گزشتہ 20 سالوں کے دوران پاکستان کے سماجی بہبود کے شعبوں میں نجی رضا کارانہ اقدامات میں خاصا اضافہ ہوا ہے۔ گیارہویں پانچ سالہ منصوبے (2013-2018) کے مطابق، تنظیموں کا ایک ترقی یافتہ نیٹ ورک مقامی کمیونٹی کے تعاون سے صحت، تعلیم، کمیونٹی کی ترقی اور پناہ سمیت سماجی ضروریات کے وسیع سلسلے کو پورا کرے گا۔ مجموعی انفرادی اور کارپوریٹ شعبہ کئی سالوں سے 70 ارب روپے سے زائد رقم فراہم کر رہا ہے جو تحفظ کے پروگراموں کے لیے حکومتی اخراجات کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ مذکورہ وسائل کے اندر رہتے ہوئے، اختراع اور ہنرمند افرادی قوت کے ذریعے بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر، بنیادی نگہداشت صحت کے نظام کو مستحکم کیا جا سکتا ہے اور لیڈی ہیلتھ ورکرز اور ضلعی ہسپتالوں کی نرسوں کی مدد سے اس میں معمر افراد کے لیے شفا بخش، انسدادی اور آبادکاری سے متعلق خدمات کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کم از کم ضلع کی سطح پر فلاحی اداروں کی مدد سے پناہ گاہیں اور اولڈ ایج ہومز قائم کرنے کی بھی ضرورت ہے۔

ہیلپ ایج انٹرنیشنل ایک غیر سرکاری تنظیم (این جی او) ہے جو پاکستان میں معمر افراد کی سماجی تحفظ سے متعلق پالیسیوں اور پروگراموں میں بہتر شمولیت کی وکالت کرتی ہے اور ملک کے مالی شعبے کی حوصلہ افزائی کرتی ہے کہ وہ معمر خواتین اور مردوں کے ذریعہ معاش کی بہتر طور پر معاونت کرے۔ یہ سول سوسائٹی، میڈیا، تعلیمی اداروں اور معمر افراد کی تنظیموں کے ساتھ بھی تعاون کرتی ہے تا کہ وہ پاکستان میں بوڑھے لوگوں کے حقوق کے تحفظ اور فروغ کے لیے مہم چلا سکیں۔ یہ خاص طور پر ان علاقوں پر توجہ مرکوز رکھتی ہے جہاں غریب، معمر، اور معذوری کا شکار افراد سب سے زیادہ محرومی کا شکار ہیں۔

معاونتی ٹیکنالوجی اور رسائی

پاکستان نے حال ہی میں ورلڈ ہیلتھ اسمبلی کی جانب سے معاونتی ٹیکنالوجیوں تک رسائی کے حوالے سے منظور کردہ عالمی قرارداد پر عمل درآمد میں پہل کی جس کے تحت معذوری کا شکار افراد، معمر افراد اور دیرینہ امراض میں مبتلا افراد نقل و حرکت میں مدد دینے والے آلات، مصنوعی اعضاء اور پیغام رسانی میں مدد دینے والے آلات کی دستیابی کی بدولت ایک باوقار زندگی گزار سکتے ہیں۔ عالمی ادارہ صحت نے متعدد سروے کے ذریعے 50 معاونتی آلات جیسے کہ سماعت کے آلات، وہیل چیئرز، چشمے، مصنوعی ٹانگیں، یادداشت میں مدد دینے والے ذرائع، اور پِل آرگنائزرز کو حتمی شکل دی ہے اور اس کے اندازے کے مطابق ایک ارب سے زائد لوگوں کو ان کی ضرورت ہے۔ عالمی صحت اسمبلی

عمر رسیدہ لوگوں کو عام انتخابات کے دوران پولنگ اسٹیشنوں پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا

مئی 2019ء میں اس بات کا فیصلہ کرے گی کہ آیا یہ آلات مفت فراہم کیے جائیں یا پھر کم قیمت پر۔

تاہم بین الاقوامی لابنگ کے علاوہ، حکومت کو معمر افراد اور دیگر معذوری کا شکار افراد کے لیے معاونتی آلات اور بحالی کی خدمات کی کی فراہمی کو بھی یقینی بنانا چاہئے۔ اسلام آباد، جہاں 2005ء کے زلزلے کے بعد امدادی ایجنسیوں کی مدد سے حرام مغز سے متعلق چوٹوں اور بحالی امداد کے مراکز قائم کیے گئے تھے میں بحالی کی ادویات کے قومی ادارے کو دوبارہ فعال کرنے اور ڈاکٹروں، فزیوتھیراپسٹس اور معاون عملے کی تمام خالی آسامیوں کو پُر کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح حکومت مختلف تنظیموں جیسے کہ ہلال احمر کی بین الاقوامی کمیٹی (آئی سی آر سی)، مسلح افواج کا ادارہ برائے بحالی ادویات (افرم)، ادارہ برائے جسمانی ادویات و بحالی ڈو یونیورسٹی، اور جے پی ایم سی اور میو ہسپتال، جہاں مصنوعی اعضاء فراہم کرنے والے چھوٹے چھوٹے یونٹ بھی موجود ہیں، کی مدد سے مصنوعی اعضاء اور تمام معاونتی آلات کے معیار میں نمایاں بہتری لاسکتی ہے۔

اسی دوران تمام حکومتی محکموں کے علاوہ نجی شعبے کے ادارے پاکستان کے 2006ء کے رسائی سے متعلق ضابطے کا بھی وسیع طور پر نفاذ کر سکتے ہیں جس میں سرکاری بنیاد دی ڈھانچے کے معیارات بیان کیے گئے ہیں۔ توسیع شدہ دسترس جو مہنگی نہیں ہے اور جو بہرصورت قانون کے تحت تمام سرکاری اور نجی شعبے کے اداروں کے لیے ایک لازمی شرط ہے، تمام لوگوں میں یہ شعور پیدا کرے گی کہ کہ وہ معمر افراد پر مناسب توجہ دیں۔

ایک اور اہم پہلو مراکز تک جسمانی رسائی ہے۔ مثال کے طور پر، اس سال عام انتخابات کے دوران ایسے متعدد پولنگ اسٹیشنوں کی اطلاعات سامنے آئیں جہاں معمر اور معذوری کا شکار افراد کے لیے بیت الخلاء سمیت کسی بھی چیز کا انتظام نہیں کیا گیا تھا۔

پنشنیں

دی ایمپلائز اولڈ ایج بینیفٹ ایکٹ 1976ء اور اس میں بعد میں ہونے والی ترامیم کے تحت تمام صنعتی اور تجارتی اداروں پر لازم ہے کہ وہ اپنے ملازمین کا اندراج کریں اور ان کی پنشن اور انشورنس کی اسکیموں کے حوالے سے ان کی تنخواہوں کا 6 فیصد باقاعدگی سے ایمپلائز اولڈ ایج بینیفٹ انسٹی ٹیوٹ (ای او بی آئی) کو جمع کرائیں۔ تاہم یہ فوائد رسمی شعبے تک محدود ہیں جبکہ غیر رسمی شعبہ جس کا معیشت میں حصہ 70 فیصد ہے اس دائرے سے باہر ہے۔ غیر رسمی، یومیہ اجرت اور ٹھیکے پر کام کرنے والے ملازمین کو پنشن یا انشورنس کی کوئی سہولت نہیں دی جاتی۔ موخر الذکر کے حوالے سے ای او بی آئی کی کارکردگی کو کافی تنقید کا سامنا رہا ہے کیونکہ اس نے اطلاعات کے مطابق، ملازمین کے اربوں روپوں کا غلط استعمال اور ان میں خورد برد کیا ہے۔

ای او بی آئی کے پنشن یافتہ افراد بجٹ میں پنشن میں اضافے کا مسلسل مطالبہ کرتے رہے ہیں۔ نومبر 2018ء میں حکومت نے پنشن میں 20 فیصد اضافے کا اعلان کرتے ہوئے پنشن کی رقم کو 5250 روپے سے بڑھا کر 6500 روپے کر دیا۔ یہ اقدام بظاہر پاکستان کو ایک فلاحی ریاست میں تبدیل کرنے کے وژن کا حصہ تھا۔

ریٹائرمنٹ کے فوائد میں تاخیر کی اطلاعات رسمی شعبے میں بھی سامنے آتی رہیں۔ مئی میں یہ خبر سامنے آئی کہ ملک کے اعلیٰ ترین ریسرچ کے ادارے، پاکستان کونسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ (پی سی ایس آئی آر) کے پنشن گزاروں کو فوائد کی ادائیگی میں 11 ماہ کی تاخیر کی وجہ سے مشکلات کا سامنا تھا۔

وقار اور حصہ

اقوام متحدہ کے آبادی فنڈ (یو این ایف پی اے) کے مطابق پاکستان کی آبادی کا ایک بڑا حصہ نوجوانوں پر مشتمل ہے جبکہ موجودہ بزرگ آبادی 2050ء تک چار کروڑ تیس لاکھ سے زائد ہو جانے کی توقع ہے۔ مکمل طور پر علیحدہ نسلوں سے تعلق رکھنے والے مختلف عمر کے گروہوں، جو دیگر سماجی و سیاسی اور معاشی تفریقات کے علاوہ ڈیجیٹل تقسیم کی وجہ سے تباہی کا شکار ہیں، کے لیے ملازمت اور مفید پیشے تلاش کرنے کے مشترکہ مسائل ناقابل تسخیر معلوم ہوتے ہیں، جس کے لیے ریاست اور معاشرہ تیار نہیں ہیں۔ گزشتہ 50 سالوں کے دوران ہنرمند افراد کی بیرون ملک نقل مکانی کا مسئلہ بھی سامنے آیا ہے جس کے سبب نوجوان اپنے والدین کو چھوڑ کر بیرون ملک نقل مکانی کر جاتے ہیں اور ان کے والدین کو اپنی ضروریات زندگی کا خود بندوبست کرنا پڑتا ہے۔ دیہی علاقوں میں جہاں محنت کشوں نے دیگر ممالک کا رخ کیا ہے، گزارے کے لائق زندگی گزارتے ہیں اور ان میں سے بہت کم کسی قسم کی بچت کر پاتے ہیں۔

بہت سے معمر افراد رضاکارانہ خدمات، سرکاری اداروں کے نظم و نسق اور کمیونٹی کی سطح کے اداروں میں شرکت کے ذریعے کمیونٹی اور شہری زندگی میں فعال کردار ادا کرتے ہیں۔ معمر افراد تجربے اور حکمت کے علاوہ ادارتی اور تاریخی یادداشت بھی رکھتے ہیں۔ وہ ثقافت کے امین، سماجی روایات، نایاب علم اور ان مہارتوں کے مخزن ہیں جو نہ صرف نوجوانوں کی تکمیل کر سکتی ہیں بلکہ ان کی قدر میں بھی اضافہ کر سکتی ہیں۔

دیہی علاقوں میں جہاں سے افرادی قوت دیگر ملکوں میں نقل مکانی کر گئی ہے،
عمر رسیدہ کو زندگی کی صرف انتہائی ضروری ضروریات دستیاب ہیں اور صرف چند ایک نے مستقبل کے لیے کچھ بچا کر رکھا ہوا ہے

پاکستان جیسے ملک میں جہاں قابل اساتذہ، ڈاکٹروں اور محققین کی قلت ہے، ریٹائرمنٹ کے بعد معمر افراد کو دوبارہ روزگار کی فراہمی نہ صرف ریاست بلکہ خود معمر افراد کو بھی فائدہ پہنچائے گی۔ حتیٰ کہ زیادہ آمدن والے ممالک میں بھی یہ پیشہ ور ماہرین 65 سال کی عمر کے بعد بھی کئی سالوں تک کام کرتے رہتے ہیں۔ پاکستان کے معمر افراد کو بوجھ کی بجائے ایک اثاثے کے طور پر دیکھا جانا چاہئے۔

سفارشات

☆ معمر افراد کی رسائی، ہسپتالوں میں الگ وارڈز، اور خدمات کے تمام مراکز جیسے کہ ریلوے اور بس اسٹیشنوں، بینکوں، سینماؤں، عجائب گھروں، اور ایئر پورٹ امیگریشن کاؤنٹرز پر بزرگ شہریوں کے لیے علیحدہ کاؤنٹرز سمیت دیگر ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ایک قومی پالیسی کی تشکیل اور نفاذ کیا جائے۔

☆ بزرگ شہریوں سے متعلق قوانین کو معمر افراد کے وقار اور حقوق کا بامقصد ذریعہ بنایا جائے۔

☆ پیمرا کی مدد سے میڈیا میں معمر افراد کے حقوق کے حوالے سے عوام کی آگہی میں اضافہ کیا جائے تاکہ حکومتی پالیسیوں اور اقدامات کے لیے حمایت حاصل کی جا سکے۔

☆ تمام ہسپتالوں کو اس بات کا پابند کیا جائے کہ وہ معمر افراد کے لیے مفت آئی کیمپس اور سرجریوں، دانتوں کے معائنے کے کیمپس، فزیوتھراپی، اور لیبارٹری ٹیسٹس کا اہتمام کریں۔

☆ مقامی کمیونٹیوں اور دیکھ بھال کرنے والوں کی مدد سے ورزش اور تفریحی سرگرمیوں کے مراکز قائم کیے جائیں۔

معذوری کا شکار افراد

قانون کی نظر میں تمام شہری برابر اور قانون کے مساوی تحفظ کے حق دار ہیں۔

آئین پاکستان۔آرٹیکل 25(1)

پیدائشی وقار، انفرادی خودمختاری کا احترام بشمول اپنی مرضی کا انتخاب کرنے کی آزادی، اور افراد کی آزادی؛ عدم امتیاز؛ معاشرے میں مکمل اور مؤثر شرکت اور شمولیت؛ معذوری کا شکار افراد کے فرق اور قبولیت کا احترام جو انسانی تنوع اور انسانیت کا حصہ ہے؛ مساوی مواقع؛ رسائی؛ مردوں اور خواتین کے درمیان برابری؛ معذوری کا شکار بچوں کی ارتقائی صلاحیتوں کا احترام اور معذوری کا شکار بچوں کے اپنی شناخت کے تحفظ کا احترام۔

معذوری کا شکار افراد کے حقوق کا معاہدہ

آرٹیکل 3-عام اصول

فریق ریاستیں ہر سطح پر ایک جامع نظام تعلیم کو یقینی بنائیں گی۔۔۔۔فریق ریاستیں اس بات کو یقینی بنائیں گی کہ معذوری کا شکار افراد کو معذوری کی بنیاد پر عمومی نظام تعلیم سے خارج نہ کیا جائے، اور یہ کہ معذوری کا شکار بچوں کو معذوری کی بنیاد پر مفت اور لازمی بنیادی تعلیم یا ثانوی تعلیم سے محروم نہ رکھا جائے۔

معذوری کا شکار افراد کے حقوق کا معاہدہ

آرٹیکل (الف)(2)(1)24

فریق ریاستیں تسلیم کرتی ہیں کہ معذوری کا شکار افراد کو معذوری کی بنیاد پر امتیاز کے بغیر صحت کے اعلیٰ ترین قابل حصول معیارات سے مستفید ہونے کا حق حاصل ہے

معذوری کا شکار افراد کے حقوق کا معاہدہ

آرٹیکل 25

فریق ریاستیں تسلیم کرتی ہیں کہ کسی ذہنی یا جسمانی طور پر معذور بچے کو ایک مکمل اور باوقار زندگی گزارنے کا حق حاصل ہے، ایسے حالات میں جو وقار کو یقینی بنائیں، خود انحصاری کو فروغ دیں اور بچے کی کمیونٹی میں مؤثر شرکت کو آسان بنائیں۔

معذوری کا شکار افراد کے حقوق کا معاہدہ

آرٹیکل 23(1)

ہر فریق ریاست، ملکی حالات، رجحانات اور امکانات کو مدنظر رکھتے ہوئے، معذوری کا شکار افراد کی فنی تربیت اور ملازمت سے متعلق ایک قومی پالیسی تشکیل دے گی، اس پر عمل درآمد کرے گی اور اس کا مرحلہ وار جائزہ لے گی۔

آئی ایل او کنونشن 159

آرٹیکل 2

پاکستان میں معذوری

عالمی ادارہ صحت کی عالمی رپورٹ برائے معذوری 2011ء کے اندازے کے مطابق ایک ارب سے زائد یا عالمی آبادی کا تقریباً 15 فیصد (2010ء کے آبادی سے متعلق اندازوں کے مطابق) کسی نہ کسی قسم کی معذوری کا شکار ہیں۔ پاکستان کی قومی مردم شماری 1998ء کے اعداد و شمار کے مطابق معذوری کی سات درجہ بندیوں جیسے کہ لنگڑے پن کا شکار، ذہنی طور پر معذور، کثیر الجہت معذوری، نابینا، بہرے، گونگے اور دیگر کے تحت معذوری کا پھیلاؤ کل آبادی کا 2.38 فیصد تھا۔ معذوری کا شکار افراد (پی ڈبلیو ڈیز) میں سے 7.6 فیصد ذہنی طور پر پسماندہ' تھے۔ یہ عمومی اصطلاح ذہنی نشوونما میں خلل، سیکھنے کے عمل میں رکاوٹ، ذہنی معذوریوں اور سینڈرم میں تفریق نہیں کرتی۔

2017ء کی مردم شماری ظاہر کرتی ہے کہ معذوری کا شکار افراد (پی ڈبلیو ڈیز) کی تعداد 2011 کی نسبت 6.1 فیصد کم ہو کر 32 لاکھ ہوگئی، لیکن یہ اعداد و شمار متنازعہ ہیں۔ معذوری کا شکار افراد کی گنتی کرنے کا فیصلہ مردم شماری کے پہلے دن سپریم کورٹ کے حکم پر کیا گیا اور یو این ایف پی اے نگران مشن نے اس بات کا مشاہدہ کیا کہ شمار کنندوں نے اس سلسلے میں بہت کم سوالات پوچھے۔ پی ڈبلیو ڈیز کے اندراج اور تخمینے کے جدید اور مؤثر نظام کی غیر موجودگی میں علاج، خدمات، تعلیم اور ملازمت کے لیے درکار فنڈز کا صحیح طور پر اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

تاہم، یہ اعداد و شمار معذور افراد کی زندگیوں کو متاثر کر رہے ہیں کیونکہ نہایت کم بجٹ مختص کیے جانے کی وجہ سے علاج اور بحالی جیسے کہ طبی نگہداشت، خصوصی تعلیم کے مواد اور امداد، اساتذہ کی تربیت، پروستھیٹکس، فزیو تھراپی، اور سائیکوتھراپی کے حوالے سے بمشکل ہی کوئی سہولیات موجود ہیں۔

معذوری سے متعلق عالمی رپورٹ 2011ء کے 2002ء سے 2004ء تک کے صحت کے عالمی سروے کے اندازے کے مطابق پاکستان میں معذوری کا تناسب کل آبادی کا 13.4 فیصد تھا، جبکہ آغا خان یونیورسٹی

مظاہرین معذوری کے شکار افراد کے حقوق میں اضافے کا مطالبہ کر رہے ہیں

کی ایک تحقیق، 'سندھ کے ایک دیہی ضلعے میں بچپن میں معذوری کا پھیلاؤ' میں کہا گیا ہے کہ کم اور متوسط آمدن والے ممالک میں ہونے والی نمونے کی تحقیق کے اندازوں کے مطابق بچپن میں معذوری کا پھیلاؤ 12.7 فیصد تھا۔ لاہور ہائی کورٹ میں نومبر 2018ء میں بچوں کے کمیشن کی جانب سے جمع کرائی گئی رپورٹ کے مطابق ملک میں تقریباً دو کروڑ دس لاکھ بچے ذہنی نشوونما میں رکاوٹ کا شکار ہیں (امریکہ میں بیماری کی روک تھام کے مرکز کے اندازے)، جبکہ دیگر معذوریوں جیسا کہ بصارت اور سماعت سے محرومی، دماغی فالج، اور جسمانی معذوری کی شرح بھی 1998ء کی مردم شماری کے مقابلے میں نمایاں طور پر زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ، پاکستان دنیا کے ان ممالک میں سے ایک ہے جہاں حادثات، بم دھماکوں، اور پیشہ ورانہ چوٹ کے باعث ہونے والی معذوری کی شرح سب سے زیادہ ہے۔ چنانچہ عالمی ادارہ صحت کے اندازوں پر مبنی 15 فیصد آبادی میں معذوری کے پھیلاؤ کا تناسب حکومتی اعداد و شمار کے مقابلے میں حقیقت سے قریب تر معلوم ہوتا ہے۔

مئی 2018ء میں یہ خبر سامنے آئی کہ پاکستان نے جنیوا میں عالمی صحت اسمبلی (ڈبلیو ایچ اے) میں معذوری کا شکار افراد اور معمر آبادی نیز ناقابل انتقال بیماریوں سے متاثرہ افراد کے لیے امدادی ٹیکنالوجیز تک رسائی کی حمایت میں پہل کی تھی۔

اگرچہ یہ اقدام قابل تحسین ہے تاہم پاکستان معذوری کا شکار افراد سے متعلق معاہدے، جس کی اس نے 2011ء میں توثیق کی تھی، کی بنیاد پر قوانین وضع کرنے میں ناکام رہا ہے۔ 2006ء کے ضابطہ رسائی جس میں سرکاری بنیادی ڈھانچے کے معیار بیان کیے گئے ہیں اب بھی غیر فعال ہے۔ اور 2002ء کی پی ڈبلیو ڈی پالیسی جس کے تحت دیگر امور کے علاوہ جامع تعلیم متعارف کرائی جاسکتی تھی، پر تاحال عمل درآمد نہیں کیا گیا۔

معذوری کا شکار افراد کے لیے پالیسیاں

آئین تعلیم کے حق' کی بنیادی حق کے طور پر ضمانت دیتا ہے۔ معذوری کا شکار افراد (ملازمت اور بحالی) آرڈیننس 1981ء نے معذوری کا شکار افراد کے لیے سہولیات اور قانون سازی جیسے کہ پاکستان بیت المال ایکٹ 1992ء، قومی پالیسی برائے خصوصی تعلیم 1999ء، معذوری کا شکار افراد سے متعلق قومی پالیسی 2002ء، ذہنی صحت کا آرڈیننس 2001ء، معذوری کا شکار افراد سے متعلق قومی ایکشن پلان 2006ء، اور خصوصی شہریوں کا ایکٹ 2008ء کے لیے بنیاد فراہم کی۔ وفاقی حکومت نے معذوری کا شکار افراد کی بحالی کے لیے قومی کونسل برائے بحالی معذوراں اور قومی ٹرسٹ برائے افراد باہم معذوری بھی قائم کیا۔ ان میں سے زیادہ جامع دستاویز قومی ایکشن پلان برائے معذوراں تھا لیکن اس پر کبھی عمل درآمد نہیں کیا گیا۔

پاکستان بیت المال (ترمیمی) ایکٹ 2018ء میں معذوری کا شکار بچوں کی بحالی کی شق بھی شامل ہے۔ اس میں اس بات کو بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ دور افتادہ اور پسماندہ علاقوں میں رہنے والے افراد کو ان سہولیات اور امداد تک بہت کم رسائی حاصل تھی۔ اس ایکٹ کو منظور کرتے وقت دماغی فالج سے متاثرہ بچوں کی جسمانی، پیشہ ورانہ اور زبان کی

تھراپی کی ضرورت کا خصوصی ذکر کیا گیا۔ اٹھارہویں ترمیم کے بعد بلوچستان نے 2017ء میں معذوری کا شکار افراد ایکٹ منظور کیا جو اس سے پہلے کی قانون سازی کے طریقہ کار کے مطابق بنیادی سہولیات فراہم کرتا ہے۔

سندھ معذوری کا شکار افراد کی خودمختاری کا ایکٹ 2018ء ایک زیادہ جامع قانون ہے جو حقوق پر مبنی ایک ایسے طریقہ کار پر زور دیتا ہے جس کی بنیاد سی آر پی ڈی کے بنیادی اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ اس ایکٹ میں نہ صرف جسمانی، ثقافتی، اور نظام میں پائی جانے والی رکاوٹوں کو دور کرتے ہوئے بلکہ مثبت کارروائی کے لیے متعدد اقدامات کرتے ہوئے معذوری کا شکار افراد کی سماجی اور معاشی شمولیت پر زور دیا گیا ہے تاکہ تمام اداروں اور برادریوں میں میں مساوی مواقع، رسائی اور صنفی برابری کو یقینی بنایا جاسکے۔

اکتوبر میں سپریم کورٹ نے وفاقی اور صوبائی حکومتوں کو حکم دیا کہ وہ گزشتہ پانچ سالوں کے دوران اپنے بجٹ میں معذوری کا شکار افراد کے لیے مختص فنڈز کی تفصیلات جمع کرائیں۔ اس نے حکومتوں کو یہ ہدایت بھی کی کہ وہ بتائیں کہ آیا اس حوالے سے مزید قانون سازی کی ضرورت ہے یا نہیں۔ بنچ معذوری کا شکار افراد کی جانب سے دائر کی گئی ایک درخواست کی سماعت کر رہا تھا جس میں سرکاری ملازمتوں میں معذوری کا شکار افراد کے تقرر کے لیے ایک پالیسی بنانے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

سپریم کورٹ میں نومبر 2018ء میں جمع کرائی گئی اپنی رپورٹ میں پنجاب حکومت نے کہا کہ اس نے معذوری کا شکار افراد کے اندراج اور تخمینے کے لیے معلومات کے انصرام سے متعلق نظام کی منظوری دے دی ہے۔

خیبر پختونخوا حکومت کی رپورٹ میں کہا گیا کہ خیبر پختونخوا معذوری کا شکار افراد کے حقوق، بحالی اور خودمختاری نامی ایک مسودہ قانون زیر غور تھا اور اسے جلد ہی بحث اور منظوری کے لیے صوبائی اسمبلی میں پیش کیا جائے گا۔

اس دوران، بنچ نے ریمارکس دیے کہ ملک جسمانی طور پر افراد باہم معذوری کے لیے قانونی فریم ورک کے لحاظ سے دنیا کے دیگر ممالک سے کافی پیچھے ہے اور اس حوالے سے موجودہ قوانین پر عمل درآمد نہیں کیا جارہا۔

نومبر میں ہی لاہور ہائی کورٹ نے معذوری کا شکار افراد (ملازمت اور بحالی) آرڈیننس 1981ء کے تحت معذوری کا شکار افراد کی بحالی' کے نام سے جاری کیے گئے ایک سرکلر میں تمام ڈسٹرکٹ اور سیشن ججوں کو ہدایت کی کہ وہ معذوری کا شکار افراد کے مقدمات کو ترجیحی بنیادوں پر نمٹائیں۔ چیف جسٹس نے یہ بھی ہدایت کی کہ صوبے کی تمام ضلعی عدالتوں میں معذوری کا شکار افراد کی سہولت کے لیے وہیل چیئرز مہیا کی جائیں۔

معذوری کا شکار بچے

معذوری کا شکار بچے پاکستان میں بچوں کا سب سے زیادہ نظرانداز شدہ طبقہ ہے۔ 3 دسمبر کو معذوری کا شکار افراد کے عالمی دن کے موقع پر گفتگو کرتے ہوئے وفاقی وزیر تعلیم نے کہا کہ نئی حکومت معذوری کا شکار بچوں کے حقوق، بالخصوص ان کی تعلیم تک رسائی پر خصوصی توجہ دے رہی ہے اور ان کی زندگیوں کو بدلنے کے لیے تمام ضروری اقدامات کیے جائیں گے۔ بعدازاں دسمبر میں "آئی سی ٹی معذوری کا شکار افراد کے حقوق کا بل 2018ء" متعارف

پاکستان میں کم از کم 700,000,1 بچے خود تسکینی کے مرض کا شکار ہیں جن میں سے 340,000 لڑکیاں ہیں

کرایا گیا اور اسے مزید غور وخوض کے لیے متعلقہ قائمہ کمیٹی کو بھیج دیا گیا۔

2018ء میں معذوری کا شکار بچوں کی بہبود کے لیے صوبائی سطح پر چند اقدامات کیے گئے۔ سندھ معذوری کا شکار افراد کا ایکٹ 2018ء ریاست کو اس بات کا پابند کرتا ہے کہ وہ آگہی پیدا کرتے ہوئے اور تعلیم میں برابری، رہن سہن اور سماجی تحفظ کے مناسب معیار، ان کی صلاحیتوں کے احترام، اور ان کے گھر، خاندان اور شناخت کے حق کو یقینی بناتے ہوئے معذوری کا شکار بچوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے خصوصی اقدامات کرے۔ خیبر پختونخوا حکومت نے بھی صوبے میں خصوصی بچوں کے لیے تعلیمی مواقع میں بہتری کے لیے کئی منصوبوں کا اعلان کر رکھا ہے۔

آٹیزم سپیکٹرم ڈِس آرڈر ویلفیئر ٹرسٹ (اے ایس ڈی ڈبلیوٹی) کے مطابق پاکستان میں خود محویت کا شکار بچوں کی تعداد کم از کم 1,700,000 ہے جن میں سے 340,000 لڑکیاں ہیں۔ بین الاقوامی اشاریوں کی بنیاد پر مرتب کیے گئے یہ اعداد وشمار اے ایس ڈی ڈبلیوٹی نے لاہور میں خود محویت کے عالمی دن 2018ء کے موقع پر منعقد ہونے والے ایک سیمینار میں پیش کیے تھے۔ اس موقع پر یہ بھی کہا گیا کہ ان بچوں کو تشدد کے خطرے کا زیادہ سامنا تھا، خاص طور پر دیہی علاقوں میں جہاں وہ توہم پرستی کا نشانہ بنتے ہیں۔ نگہداشت کی سہولیات کی کمی خود محویت کا شکار بچوں کے عدم تحفظ میں مزید اضافہ کرتی ہے۔

کچھ خصوصی بچے خصوصی اسکولوں میں جاتے تو ہیں لیکن ان اسکولوں کی تعداد بہت کم ہے اور یہ 100 میں سے صرف ایک بچے کی ضروریات کو پورا کرتے ہیں۔ تاہم اس حوالے سے چند خوش آئند اقدامات بھی کیے گئے۔ نومبر میں وزیر اعلیٰ سندھ نے کراچی کے علاقے گلستان جوہر میں سندھ خود محویت کے مرکز برائے بحالی وتربیت کا سنگ بنیاد رکھا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ جنوبی ایشیا میں اپنی طرز کا سب سے بڑا ادارہ ہے۔ اس مرکز میں

300 بچوں کی گنجائش ہے اور اس میں 200 بچوں کو پہلے ہی رجسٹر کیا جا چکا ہے۔

تعلیم اور ملازمت

پاکستان میں معذوری کا شکار افراد مایوس کن حالات میں زندہ ہیں ان کے لیے مکتبی تعلیم، تربیت اور ملازمت کے مواقع بہت کم ہیں۔

سرکاری اور نجی شعبے کے مرکزی اسکول عمومی طور پر معذوری کا شکار بچوں کو داخلہ نہیں دیتے۔ اعلیٰ تعلیم کے زیادہ تر سرکاری تعلیمی ادارے بصارت سے محروم اور جسمانی طور پر معذوری کا شکار افراد کو قبول تو کرتے ہیں لیکن معذوری کا شکار افراد کی ایک مختصر تعداد ہی اس سطح تک پہنچ پاتی ہے۔ فنی اور پیشہ ورانہ تربیت کے مواقع بہت محدود اور صرف ان لوگوں کے لیے دستیاب ہیں جنہوں نے میٹرک یا اعلیٰ امتحانات پاس کیے ہوں۔

جامع تعلیم ان ترقی پذیر ممالک کا ایک پیچیدہ مسئلہ اور اہم ضرورت ہے جہاں انسانی وسائل اور سرمایہ سے متعلق وسائل بہت محدود ہیں کیونکہ اس کے لیے اسکولوں میں اصلاحات اور تعمیر نو کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ مختلف حالات اور قابلیتوں کے حامل بچوں کی ضروریات کو پورا کیا جا سکے۔ ایک جامع نظام تعلیم رواداری، قبولیت اور تنوع کی قدر شناسی کی تعلیم دیتے ہوئے معاشرے میں بچوں کے تمام گروہوں کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ اس کے علاوہ مرکزی اسکولوں کو جامع اسکولوں میں تبدیل کرنے میں کم اخراجات آتے ہیں بجائے اس کے کہ خصوصی تعلیم کے ایسے علیحدہ مراکز قائم کیے جائیں جو معذوری کا شکار بچوں کی ایک بہت کم تعداد کی ضروریات کو پورا کر سکتے ہیں۔

پنجاب میں بصارت سے محروم افراد نے اپنے مساوی حقوق کے لیے سڑکوں پر احتجاج جاری رکھا۔ مئی 2018ء میں لاہور ہائی کورٹ نے ایک پٹیشن کی سماعت کی جو عدالتی فعالیت پینل نامی این جی او نے بصارت سے

حکومت نے معذوری کے شکار افراد کے لیے ملازمتوں کا دو فیصد کوٹہ مختص کیا ہے مگر یہ ان کی ضرورت کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں

محروم افراد کی طرف سے دائر کی تھی۔ لاہور ہائی کورٹ نے پٹیشن پر حکومت پنجاب کو نوٹس جاری کیا۔ اس سے پہلے اسی ماہ پاکستان تحریک انصاف نے پنجاب سیکریٹریٹ میں ایک قرارداد جمع کرائی تھی جس میں بصارت سے محروم افراد کے حقیقی دیرینہ مطالبات کو تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

حکومت نے معذوری کا شکار افراد کے لیے ملازمت میں دو فیصد کوٹہ مختص کیا ہے لیکن یہ ان کی ضروریات کو پورا نہیں کرتا اور مختص کوٹے پر عملدرآمد نہ ہونا بھی عام سی بات ہے۔ نجی کمپنیاں کوٹہ پر عملدرآمد نہ کرنے کا معمولی سا جرمانہ ادا کر دیتی ہیں۔ سندھ اور پنجاب حکومتوں نے معذوری کا شکار افراد کے لیے کوٹہ بڑھا کر تین فیصد کر دیا ہے۔

صحت اور سہولیات

پاکستان دنیا کے ان ممالک میں سے ایک ہے جہاں کزنوں کے درمیان ہونے والی شادیوں (ہم خون شادیوں) کی شرح سب سے زیادہ ہے جو موروثی اور خاندانی بیماریوں کا باعث بن سکتی ہیں۔ ابھی تک، حکومت نے خاندانوں، شادی شدہ جوڑوں اور شادی کے قابل عمر کے نوجوان افراد کو آگہی کی فراہمی کے ذریعے معذوری پر قابو پانے کے لیے کسی قسم کے اقدامات نہیں کیے۔ غربت اور آگہی کی کمی کے باعث بچوں میں کئی معذوریوں کی تشخیص نہیں ہو پاتی، یوں علاج اور اصلاح میں بہت دیر ہو جاتی ہے۔

ناکافی بنیادی نگہداشت صحت، ناقص حفظان صحت، غذائیت کی کمی، پینے کے صاف پانی کی کمی اور ویکسی نیشن اور پولیو کے بچاؤ کے قطروں کی اہمیت سے انکار کے باعث غریب لوگوں میں بیماری اور معذوری کی شرح میں اضافہ ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تربیت یافتہ پیشہ ور ماہرین کی شدید قلت ہے اور 2018ء میں ملک میں صرف 589 رجسٹرڈ ماہر نفسیات موجود تھے، جبکہ بہت سے عام معالج اور ماہرین امراض بچگان ذہنی اور دماغی نشوونما میں خلل جیسے کہ خود تسکینی، توجہ کی کمی اور زائد عاملیت، سیکھنے سے معذوری، دوقطبی اور دیگر حالتوں سے واقف نہیں ہوتے۔

جسمانی معذوری کا شکار افراد میں ذہنی تناؤ کی شرح بھی بہت زیادہ ہے کیونکہ وہ ایک ایسی پیچیدہ صورتحال سے دوچار ہوتے ہیں جہاں حکومت بھی ان کی قابلیتوں کو تسلیم نہیں کرتی۔ مثال کے طور پر، سماعت اور بولنے کی صلاحیت سے محروم افراد کو ڈرائیونگ لائسنس جاری نہیں کیے جاتے حالانکہ ترقی یافتہ ممالک میں سماعت اور گفتار کی صلاحیت سے محروم لوگوں کو ڈرائیونگ لائسنس دیئے جاتے ہیں۔ ایک عام سرگرمی ہے۔ دیگر ذہنی مسائل جیسے کہ صدمے کے بعد ذہنی تناؤ دنیا بھر میں معذوری، بالخصوص خود تسکینی کا شکار 70 فیصد بچوں کی ماؤں کو متاثر کرتا ہے۔

شمولیت اور عدم تحفظ

پاکستان میں معذوری سے وابستہ تہمت اور توہم پرستی معاشرے میں معذوری کا شکار افراد کو زندگی کے مرکزی دھارے میں اپنا کردار ادا کرنے سے روکتی ہے۔ جہالت، نگہداشت، دیکھ بھال کی سہولیات سے ناواقفیت اور

ان کی غیر موجودگی اور محض وقتی سہولیات کی دستیابی کے باعث کئی غریب خاندان عطائیوں اور پیروں کی مدد حاصل کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جس سے معذوری میں اضافہ ہو جاتا ہے اور کئی واقعات میں عطائیوں کے پاس جانا جان لیوا ثابت ہوتا ہے۔

دسمبر میں، ٹیکسلا میں مقامی پیروں کی ہدایات پر اپنی ذہنی طور پر معذور بہن کو گھر کے کنویں میں زندہ دفن کرنے پر دو بھائیوں کو حراست میں لے لیا گیا۔ ان کے اس اقدام کا بظاہر مقصد خاندان کو شیطانی قوتوں سے نجات دلانا تھا۔ اپریل میں، بہاولپور میں پولیس نے سات افراد کو گرفتار کر لیا جنھوں نے مبینہ طور پر خاندانی تنازعے پر بدلے کی غرض سے ایک گونگی بہری خاتون کا سر مونڈھ دیا تھا۔

معذوری کا شکار افراد کو جسمانی زیادتی کے خطرے کا سامنا رہتا ہے۔ جنوری میں کراچی میں ایک سیشن کورٹ نے 2016ء میں ایک ذہنی اور جسمانی طور پر معذور خاتون کے ساتھ جنسی زیادتی کے مقدمے میں دو افراد کو 20 سال قید کی سزا سنائی۔ فروری میں ایک 15 سالہ گونگی بہری ہندو لڑکی کے والد نے پولیس کو ایک درخواست دی جس میں انہوں نے الزام لگایا کہ صوبہ سندھ میں عمر کوٹ کے علاقے کنری میں ایک مقامی لڑکے نے ان کی بیٹی کو زیادتی کا نشانہ بنایا تھا۔ اکتوبر میں صوبہ پنجاب کے علاقے ننکانہ صاحب میں دو افراد نے سکھ برادری سے تعلق رکھنے والی جواں سال خاتون کو ایمبولینس کے اندر اجتماعی زیادتی کا نشانہ بنایا۔

اگر معذوری کا شکار افراد ہم جنس پرست مرد و زن، خواجہ سرا، لاجنس، بین الجنس، غیر معمولی (ایل جی بی ٹی کیو آئی اے) کے زمرے میں آتے ہوں، جو پاکستان میں خواجہ سرا ہی کہلاتے ہیں یہ معاشرے کے تمام گروہوں سے زیادہ محروم اور کم تر سمجھے جانے والا طبقہ ہیں۔ ہمارے ہاں معذوری کا شکار خواجہ سرا افراد کی سماج میں کوئی گنجائش نہیں اور ان کی تعلیم، نگہداشت صحت اور ملازمت تک رسائی نہ ہونے کے برابر ہے۔

معذوری متاثرہ افراد کے لیے ایک ہمہ جہتی تجربہ ہے اور ان کے اعضاء اور جسم کے مختلف حصے، شناخت اور بولنے کی صلاحیت مختلف طریقوں سے متاثر ہوتی ہے۔ پاکستان میں معذوری کی صرف چار اقسام جیسے کہ جسمانی محرومی، بصارت سے محرومی، سماعت سے محرومی اور ذہنی بیماری کو تسلیم کیا جاتا ہے اور حکومت انہی چار اقسام کی معذوریوں سے متعلقہ ضروریات پورا کرنے کے انتظام وانصرام کرتی ہے۔ دنیا بھر میں انٹرنیشنل کلاسفیکیشن، فنگشننگ، معذوری اور صحت (آئی سی ایف) کے تحت چار اقسام کی معذوریوں کی جلد شناخت کی جاتی ہے۔ دوسری جانب، امریکہ کا معذوری کا شکار افراد کی تعلیم کا ایکٹ (آئیڈیا 2004)، معذوری کی 13 مرکزی اقسام بیان کرتا ہے اور اس ایکٹ کو سندھ معذوری کا شکار افراد کی خودمختاری کا ایکٹ 2018ء میں استعمال کیا گیا ہے جس میں معذوری کے پانچ گروہوں کی تعریف بیان کی گئی ہے۔

سفارشات

☆ سماعت اور بصارت سے محرومی، بالائی ہونٹ اور تالو میں شگاف اور کسی بھی قسم کی پیدائشی یا موروثی بیماریوں

نیز ذہنی اور دماغی نشوونما میں کمی جیسے کہ خودمحویت، اے ڈی ایچ ڈی اور سیکھنے سے معذوری کی تشخیص کے لیے بنیادی نگہداشت صحت کے اہلکاروں جیسے کہ لیڈی ہیلتھ ورکرز اور دائیوں کی تربیت اور تعیناتی عمل میں لائی جائے تاکہ ان امراض میں مبتلا لوگوں کو متعلقہ ڈاکٹروں کی طرف بھیجا جاسکے۔

☆ خصوصی بچوں میں صحت کے مسائل کی نشاندہی اور نگرانی کے لیے اسکول کی سطح پر صحت کے معائنے کا نظام متعارف کرایا جائے۔صوبوں میں صحت اور غذائیت کے منتظمین کا پروگرام دوبارہ بحال کیا جائے جو کچھ سال پہلے غیر فعال ہوگیا تھا۔

☆ معذوری سے متعلق کوائف جمع کرنے کے لیے بے نظیر انکم سپورٹ کا دائرہ کار وسیع کیا جائے اور خاص طور پر ان خاندانوں کی معاونت کی جائے جن میں کوئی معذوری کا شکار بچہ موجود ہو۔معذوری کا شکار بچوں کے خاندانوں کو رقوم کی مشروط فراہمی کے نظام کو موثر بنایا جائے تاکہ وہ معائنے کے کیمپوں میں آنے کی ٹرانسپورٹ، معالجے اور دیگر اخراجات برداشت کرسکیں اور معائنے کے کیمپوں تک ان کی رسائی یقینی بنائی جاسکے۔

☆ معذوری کا شکار افراد کے معاہدے اور بچوں کے حقوق کے معاہدے پر مکمل عمل درآمد کیا جائے۔

☆ بی ایڈ اور ایم ایڈ کی سطح پر اساتذہ کو جامع تعلیم میں خصوصی تعلیم کے پیمانوں سے متعلق تربیت دی جائے تاکہ وہ نصاب کو معذوری کا شکار افراد کی ضروریات کے مطابق تبدیل کرسکیں اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی مہارت میں بھی اضافہ کرسکیں۔

☆ ذہنی نشوونما سے متعلق معذوری کو میڈیکل یونیورسٹیوں کے نصاب کا حصہ بنایا جائے خاص طور پر تحصیل کی سطح پر لیڈی ہیلتھ ورکرز، نرسوں، پیرامیڈیکس اور اسکولوں میں صحت اور غذائیت کے منتظمین کے لیے اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ ضلعی اور تحصیل ہیڈکوارٹرز ہسپتالوں کے میڈیکل سپرنٹنڈنٹ جو معذوری کے سرٹیفکیٹ جاری کرتے ہیں، ان معذوریوں کی شناخت میں مہارت رکھتے ہوں۔

☆ مساجد، مدرسوں، گرجا گھروں اور مندروں میں، جہاں لوگ جمع ہوتے ہیں اور میڈیا کے ذریعے آگہی کی مہمات کا اہتمام کیا جائے تاکہ لوگوں کو معذوری کے مسائل اور اس سے وابستہ شرمندگی کا مقابلہ کرنے کے حوالے سے حساس بنایا جاسکے۔

☆ قانون نافذ کرنے والے اداروں بشمول پولیس، وکلاء اور جیل اور اصلاحی اداروں کے وارڈنز کی تربیت کی جائے اور انہیں یہ شعور دیا کہ وہ نوعمر مجرموں میں ان معذوریوں کی شناخت کرسکیں اور اپنے مقدمات کو سی آر پی ڈی کے فریم ورک کے اندر رہتے ہوئے آگے بڑھا سکیں۔

☆ اسکولوں، پیشہ ورانہ تربیت کے اداروں، پیشہ ورانہ خدمات اور پروستھیٹکس، امدادی ٹیکنالوجی اور مقامی اور قومی

سطح پر دستیاب دیگر امدادی خدمات کا ڈیٹا بیس تشکیل دیا جائے۔

☆ ہلال احمر کی بین الاقوامی کمیٹی (آئی سی آر سی)، مسلح افواج کے بحالی کی ادویات کے ادارے (افرم)، ادارہ جسمانی ادویات و بحالی ڈاؤ یونیورسٹی، اور جے پی ایم سی اور میو ہسپتال جن کے اپنے پروسٹھیٹکس سپورٹ یونٹ بھی ہیں، کے تعاون سے اسلام آباد میں بحالی کی ادویات کے قومی ادارے کو دوبارہ فعال کیا جائے تا کہ پروسٹھیٹکس اور دیگر امدادی آلات کے معیار کو بہتر بنایا جا سکے۔

☆ قومی شناختی کارڈ کے اندراج اور حصول کے عمل کو معذوری کے اعتبار سے دوستانہ بنایا جائے۔ جائزے اور اندراج کے متحرک مراکز قائم کیے جائیں تا کہ اندراج کی ضرورت سے متعلق آگہی پیدا کی جا سکے اور ہر ضلع میں رجسٹرڈ افراد کی تعداد میں اضافہ کیا جا سکے۔ اسکولوں کو بھی معذوری کا عارضی سرٹیفکیٹ جاری کرنے کا اختیار دیا جا سکتا ہے جو چھ ماہ تک کارآمد ہو اور جس کی سرٹیفکیٹ جاری کرنے والی باقاعدہ اتھارٹی نے معین طریقہ کار کے بعد تصدیق کی جا سکے۔

☆ کھیلوں، باقاعدہ ورزش اور تفریحی سرگرمیوں کو تعلیمی نصاب کا حصہ بنایا جائے اور تمام تعلیمی اداروں میں منظم تربیت کے لیے اسپیشل اولمپکس اور پیرا اولمپکس ایسوسی ایشنز کے کوچز کی خدمات حاصل کی جائیں۔

☆ تمام عوامی مقامات بشمول پارکوں، عجائب گھروں، آرٹ گیلریوں، تاریخی مقامات، سرکاری عمارتوں، سینما گھروں، اور تفریحی سرگرمیوں کے دیگر مقامات نیز نقل و حمل (سڑکیں، ریلوے، سمندر اور فضاء) کو معذوری کا شکار افراد کی ضروریات کے مطابق اور مکمل طور پر قابل رسائی بنایا جائے اور ان میں ریمپس اور بیت الخلاء سمیت تمام سہولیات فراہم کی جائیں۔

☆ سندھ معذوری کا شکار افراد کا ایکٹ 2018ء کی مطابقت میں قوانین متعارف کرائے جائیں۔ دیگر قوانین جیسے کہ نوعمر افراد کے نظام انصاف کا ایکٹ، ضابطہ تعزیرات پاکستان کے سیکشن 89 اور جیل کے قواعد و ضوابط میں ترامیم کی جائیں تا کہ معذوری اور ذہنی عارضے کا شکار بچوں اور افراد، اور بالخصوص دماغی نشوونما میں رکاوٹ کا شکار افراد کی ضروریات کی شناخت اور انتظام و انصرام کیا جا سکے۔

مہاجرین اور آئی ڈی پیز

کسی بھی شخص کو عقیدے کی بناء پر ایذا رسانی سے بچنے کے لیے دوسرے ملکوں میں پناہ حاصل کرنے اور وہاں زندگی گزارنے کا حق حاصل ہے۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور
[آرٹیکل نمبر 14 (الف)]

کوئی بھی فریق ریاست کسی شخص کو کسی ایسی ریاست کے حوالے نہیں کرے گی یا اسے واپس نہیں لوٹائے گی جہاں اس بات کے ٹھوس شواہد موجود ہوں کہ وہاں اسے ایذا رسانی کا نشانہ بنایا جائے گا۔

ایذا رسانی اور دیگر ظالمانہ، غیر انسانی یا تضحیک آمیز سلوک کے خلاف میثاق
[آرٹیکل نمبر 3]

پاکستان 1979 سے لاکھوں رجسٹرڈ و غیر رجسٹرڈ افغان مہاجرین کی میزبانی کر رہا ہے۔ نیشنل ڈیٹا بیس اینڈ رجسٹریشن اتھارٹی (نادرا) کے مطابق پاکستان میں رجسٹرڈ افغان شہریوں کی تعداد 28 لاکھ سے زائد ہے جن میں سے 16 لاکھ کے پاس پروف آف رجسٹریشن کارڈ (پی او آر) ہیں۔ ملک میں کم از کم 10 لاکھ غیر رجسٹرڈ افغان شہری قیام پذیر ہیں۔ پاکستان میں پیدا ہونے والے 15 لاکھ افغان وزیر اعظم کے اس اعلان پر بہت خوش ہوئے تھے کہ انہیں پاکستان کی شہریت دی جاسکتی ہے تاہم ان کی خوشی اس وقت مایوسی میں بدل گئی جب یہ کہا گیا کہ اس اعلان کا مقصد محض اس موضوع پر بحث چھیڑنا تھا۔

اکتوبر 2018 میں پاکستان کی وفاقی حکومت نے پروف آف رجسٹریشن (پی او آر) کو 30 جون 2019 تک جبکہ شہریتی کارڈز (اے سی سی) کو 31 دسمبر 2018 تک توسیع دینے کا اعلان کیا۔

یہ تاثر قائم رہا کہ تمام افغان مہاجرین مجرمانہ اور دہشت گردی کی سرگرمیوں میں ملوث ہیں اور پولیس و مقامی حکام کی طرف سے مہاجرین کی ہراسانی کی خبریں سامنے آتی رہیں۔

خیبر پختونخوا کے قبائلی اضلاع (سابق فاٹا) سے ملک کے دیگر علاقوں میں نقل مکانی کرنے والے لوگوں کی اپنے مقامی علاقوں میں واپسی کا سلسلہ جاری رہا۔ گو کہ قبائلی اضلاع سے آئی ڈی پیز کی ایک بڑی تعداد اپنے گھروں کو

واپس پلٹ گئی ہے تاہم اچھی خاصی تعداد اب بھی اپنے گھر واپسی کی منتظر ہے۔لوگوں کی اپنے علاقوں سے بے دخلی کی تازہ ترین لہر 2014 میں شروع ہوئی جس کی وجہ شمالی وزیرستان اور خیبر پختونخوا میں کشیدگی تھی۔اس کے باعث خیبر پختونخوا اور قبائلی اضلاع کے دیگر علاقوں سے پہلے سے نقل مکین لوگوں کی تعداد میں مزید اضافہ ہوگیا۔خیبر پختونخوا کے ضلع بنوں، ڈیرہ اسماعیل خان، کوہاٹ، ہنگو اور پشاور میں ہزاروں آئی ڈی پیز مقیم ہیں جو اپنے گھر واپسی کا انتظار کر رہے ہیں۔

ایچ آر سی پی نے ایک بار پھر مطالبہ کیا کہ پاکستان اندرون ملک نقل مکانی کے مسائل سے نبٹنے کے لیے قانون سازی کرے مگر رواں برس کے دوران پالیسی میں کسی قسم کی تبدیلی دیکھنے کو نہ مل سکی۔

مہاجرین

ملک میں مہاجرین کی تقریباً تمام تر آبادی افغان شہریوں پر مشتمل ہے اور پاکستان اب بھی دنیا کے ان ممالک میں شامل ہے جہاں سب سے زیادہ مہاجرین قیام پذیر ہیں۔ان میں سے زیادہ تر مہاجرین کشیدگی اور تشدد سے بچ کر نکلے جس نے افغانستان کو کئی دہائیوں سے لپیٹ میں لے رکھا ہے اور انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیوں کو جنم دیا ہے۔افغانستان سے عشروں سے مہاجرین کی مسلسل آمد کا آغاز 1979 میں اُس ملک پر سوویت یونین کے حملے سے شروع ہوا اور پھر یہ سلسلہ بعد ازاں 1992 میں افغانستان میں خانہ جنگی اور پھر 2001 میں دہشت گردی کے خلاف امریکی حملے کی وجہ سے جاری رہا۔

افغان مہاجرین کی دوسری اور تیسری نسل کے کئی لوگ پاکستان میں پیدا ہوئے ہیں جو کبھی افغانستان نہیں گئے۔2018 میں افغانستان میں دہشت گردی کے حملوں کی شدت اور تعداد میں اضافے نے واپس جانے والے افغان مہاجرین کے خدشات بڑھا دیے ہیں اور افغان حکومت اور اقوام متحدہ کا کہنا ہے کہ جنگ زدہ افغانستان کے حالات مہاجرین کی واپسی کے لیے سازگار نہیں ہیں۔

اقوام متحدہ کے ہائی کمشنر برائے مہاجرین (یو این ایچ سی آر) کے مطابق، پی او آر رکھنے والے 14 لاکھ رجسٹرڈ افغانوں میں سے 58 فیصد خیبر پختونخوا میں، 23 فیصد بلوچستان میں، 12 فیصد پنجاب میں، 5 فیصد سندھ میں، 2 فیصد اسلام آباد میں اور 3.0 فیصد آزاد جموں وکشمیر (پاکستان کے زیر انتظام) میں رہ رہے ہیں۔

یو این ایچ سی آر کا یہ بھی کہنا ہے کہ 2018 میں کُل 13,584 مہاجرین رضا کارانہ طور پر پاکستان سے افغانستان واپس گئے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ افغانستان واپس جانے والے مہاجرین کی تعداد میں 76 فیصد کمی ہوئی ہے اگر اس کا موازنہ 2017 سے کیا جائے جب یو این ایچ سی آر کی مدد سے 57,411 رجسٹرڈ افغان پاکستان سے افغانستان گئے تھے۔ان کے مطابق اس کی بنیادی وجہ علاقائی سیاست کے خدوخال میں تبدیلی اور پاکستان میں افغان مہاجرین کے لیے تحفظ کے ماحول میں بہتری نیز افغانستان میں امن وامان کی بگڑتی صورتحال، قحط اور کمزور سماجی ومعاشی حالات ہیں۔

رضا کارانہ طور پر وطن واپس جانے والے رجسٹرڈ مہاجر خاندانوں میں سے 62 فیصد خیبر پختونخوا سے، 29 فیصد بلوچستان سے، 6 فیصد پنجاب سے اور 2 فیصد سندھ سے اپنے وطن واپس گئے ہیں۔ایک اندازے کے مطابق،

ملک کے تقریباً تمام مہاجرین افغان شہریوں پر مشتمل ہیں

رواں برس کے نومبر تک 30,692 غیر رجسٹرڈ افغان شہری اپنے وطن واپس گئے ہیں۔ 2002 سے لے کر اب تک، تقریباً 42 لاکھ افغان مہاجرین یو این ایچ سی آر کی مدد سے پاکستان سے جا چکے ہیں۔

یو این ایچ سی آر کے پاکستان میں رضا کارانہ وطن واپسی کے دو فعال مراکز ہیں۔ یہ مراکز خیبر پختونخوا کے علاقے ازاخیل اور بلوچستان کے شہر کوئٹہ کے علاقے بلیلی میں ہیں۔ یو این ایچ سی آر کے مطابق، ملک بھر میں مہاجرین کے 54 دیہات ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق، یکم دسمبر 2018 تک صورتحال یہ تھی کہ کل رجسٹرڈ افغان مہاجرین کا 68 فیصد پاکستان کے شہری و دیہی علاقوں میں جبکہ 32 فیصد مہاجرین کے دیہاتوں میں قیام پذیر تھے۔ یو این ایچ سی آر ہر اُس خاندان کے سربراہ کو 200 امریکی ڈالر مالی امداد دیتا ہے جو رضا کارانہ طور پر وطن واپسی کا فیصلہ کرتا ہے۔ جون سے اکتوبر 2016 کے دوران یہ رقم 400 امریکی ڈالر کر دی گئی تھی جس کے باعث وطن واپس جانے والے لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوا مگر بعد ازاں یہ کم کر کے 200 امریکی ڈالر فی سربراہ خاندان کر دی گئی۔

اندراج کا ثبوت

پاکستان میں افغان مہاجرین کے اندراج کا عمل 07-2006 میں شروع ہوا تھا۔ نیشنل ڈیٹا بیس اینڈ رجسٹریشن اتھارٹی (نادرا) نے افغانوں کا اندراج کرنا اور انہیں رجسٹریشن آف پروف (پی او آر) کارڈز جاری کرنا شروع کیے۔ پی او آر ایک شناختی دستاویز ہے جس کے باعث افغان مہاجرین کو پاکستان میں عارضی قیام اور نقل و حرکت کی آزادی کی اجازت مل جاتی ہے۔ پانچ برس سے کم عمر بچوں کے نام ان کے والدین کے کارڈز پر درج کیے گئے۔ پانچ برس تک کی عمر کے بچے اپنا پی او آر لے سکتے تھے۔ ایسے افغان مہاجرین جنہوں نے پی او آر کے لیے درخواست نہیں دی تھی یا جن کے پاس قانونی ویزا یا دیگر قابل قبول دستاویز نہیں تھی، انہیں فارنرز ایکٹ اور غیر ملکیوں

کے لیے نافذ العمل قوانین کے تحت غیر قانونی تارکینِ وطن تصور کیا گیا۔

پی او آر کا اندراج اور توسیع	
مارچ 2007	نادرا کے پاس 21 لاکھ افغانوں کا اندراج ہوا ہے اور انہیں پروف آف رجسٹریشن (پی او آر) کارڈ جاری ہوئے ہیں جن کے زائد المیعاد ہونے کی تاریخ دسمبر 2019 ہے۔
ستمبر 2010	پی او آر کارڈز کو افغان شہریوں کے لیے محفوظ کارڈز (ایس سی اے سی)' سے تبدیل کیا گیا۔ یہ 31 دسمبر 2012 تک قابل استعمال ہیں۔
جنوری 2013	31 جون 2013 تک چھ ماہ کی توسیع دی گئی۔
اگست 2013	پی او آر کارڈز کو 31 دسمبر 2015 تک توسیع دی گئی۔
جنوری 2016	جون 2016 تک چھ ماہ کی توسیع دی گئی
جون 2016	31 دسمبر 2016 تک چھ ماہ کی توسیع دی گئی
ستمبر 2016	31 مارچ 2017 تک تین ماہ کی توسیع دی گئی
مارچ 2017	پی او آر کارڈز کو 31 مارچ 2017 تک توسیع دی گئی
اکتوبر 2018	پی او آر کارڈز کو 30 جون 2019 تک توسیع دی گئی
ذریعہ معلومات: یو این ایچ سی آر	

اکتوبر 2018 میں، پاکستان کی وفاقی کابینہ نے ایک نوٹیفکیشن کے ذریعے افغان مہاجرین کے قیام میں 30 جون 2019 تک توسیع کی۔ فروری 2017 میں وفاقی کابینہ نے مہاجرین کی پالیسی وضع کی جس میں ایسے افغان شہریوں کی دستاویز سازی کے لیے منصوبے تھے جن کے پاس دستاویزات نہیں تھیں، یہ پالیسی مہاجرین پر ایک ملکی قانون بنانے اور افغان شہریوں کے لیے ویزا پالیسی نرم کرنے کے عہد کی عکاسی کرتی ہے۔ تاہم اس پر ابھی تک عملدرآمد نہیں کیا گیا اور سول سوسائٹی کا مطالبہ ہے کہ اس پر عملدرآمد کیا جائے۔

یو این ایچ سی آر کے مطابق، غیر رجسٹرڈ افغانوں کو افغان شہری کارڈز (اے سی سی) کے لیے رجسٹر کیا جائے تاکہ وہ پاکستان فارنرز ایکٹ کے تحت غیر قانونی گرفتاریوں، حراست یا ملک بدری سے محفوظ رہ سکیں۔ اے سی سی رکھنے والے افغانوں کو پاکستان میں رہنے کی اجازت ہے تاوقتیکہ انہیں افغان حکومت کی طرف سے پاسپورٹ وغیرہ جاری ہو۔

عالمی تنظیم برائے نقل مکانی (آئی او ایم) کے مطابق، 24 مئی 2018 تک اے سی سیز کے لیے تقریباً

878,604 درخواستیں موصول ہوئی تھیں۔

شہریت

پاکستان شہریت ایکٹ 1951 کے سیکشن 4 کے تحت، پاکستان میں پیدا ہونے والا کوئی بھی فرد اپنی پیدائش سے پاکستان کا شہری تصور ہوگا۔ اس اصول سے واحد استثنیٰ یہ ہے کہ اگر بچے کے والدین غیر ملکی سفیر ہوں یا ان کا تعلق ریاست کے اعلانیہ دشمن سے ہو اور بچے کی پیدائش ایک ایسی جگہ ہو جو اس وقت ریاست کے اعلانیہ دشمنوں کے قبضے میں ہو۔ 80 کی دہائی میں افغان مہاجرین کا بہاؤ شروع ہوا تو اس وقت حکومتِ پاکستان نے شہریت ایکٹ میں ترامیم کرنا ضروری نہ سمجھا۔ نہ ہی گذشتہ برسوں کے دوران کسی حکومت نے شہریت ایکٹ میں ترمیم کرنے یا افغان شہریوں کو ایکٹ سے استثنیٰ دینے کے لیے خصوصی دفعات متعارف کروانے پر غور کیا۔

پاکستان نے مہاجرین کے مقام سے متعلقہ یو این کنونشن 1951 یا اس کے 1967 پروٹوکول پر دستخط نہیں کیے۔ نتیجے کے طور پر، پاکستان نے ملک میں مہاجرین کے معاملات بشمول پاکستان میں پیدا ہونے والے افغان مہاجرین کی شہریت کے استحقاق جیسے مسائل سے عارضی اور صوابدیدی پالیسیوں کے ذریعے نبٹنے کا سلسلہ جاری رکھا ہے۔ تکنیکی لحاظ سے دیکھا جائے تو پاکستان میں پیدا ہونے والے تمام مہاجرین شہریت لینے کے مستحق ہیں، تاہم انہیں ایسا کرنے سے عمومی طور پر روکا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پاکستان میں پیدا ہونے والے افغان مہاجرین جو افغانستان واپس نہیں جانا چاہتے، انہیں اس وقت بڑے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے جب وہ پاکستان میں رہنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔

نئے منتخب ہونے والے وزیراعظم عمران خان نے ستمبر 2018 میں کہا تھا کہ پاکستان میں پیدا ہونے

عمران خان نے کہا کہ افغان اور بنگالی مہاجرین کے بچوں کو پاکستان کی شہریت دی جائے گی
مگر بعد میں کہا کہ ان کا یہ بات کرنے کا مقصد صرف اس معاملے پر بحث کو جنم دینا تھا

والے افغان اور بنگالی مہاجرین کو پاکستانی شہریت ملنی چاہیے۔ ان کا یہ بیان کراچی میں امن وامان کی صورتحال سے متعلق ایک تقریر میں سامنے آیا جس میں ان کا مطلب تھا کہ شہریت اور حقوق سے محروم لوگوں کے جرم میں ملوث ہونے کے زیادہ امکانات ہوتے ہیں (پارلیمان میں بعد میں ہونے والی ایک بحث میں انہوں نے یہ بھی کہا کہ مہاجرین انسانی سلوک کے مستحق ہیں)۔ گو کہ ان کے بیان کو بہت سے لوگوں نے خوش آئند قرار دیا، تاہم اس کی سخت مخالفت بھی کی گئی بشمول پارلیمان میں توجہ دلاؤ نوٹس کے جو حزبِ اختلاف کی جماعت پی پی پی اور حکومت کی ایک اتحادی جماعت بلوچستان نیشنل پارٹی (بی این پی) نے پیش کیا تھا۔ کچھ دنوں بعد، یہ وضاحت سامنے آ گئی کہ پی ٹی آئی حکومت کا مقصد اصلاحات پر صرف بحث چھیڑنا' تھا۔ تاہم یہ معاملہ ابھی تک زیر بحث لائے جانے اور حل ہونے کا منتظر ہے۔

نقل مکانی پر مجبور کرنے والے عوامل

2016 اور 2017 کی نسبت 2018 میں افغان مہاجرین کی رضا کارانہ وطن واپسی کی تعداد میں نمایاں کمی آنے کی کئی وجوہات ہیں۔ ان میں سے بڑی وجہ افغانستان میں پُرتشدد دہشت گردی کے حملوں میں شدید اضافہ اور افغانستان میں قانون شکنی کی فضا، انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں، عدم استحکام اور معاشی مواقع کی کمی ہے۔

پاکستان میں کئی دہائیوں سے مقیم مہاجرین نے اس ملک میں اپنے معاش کا بندوبست کر لیا ہے۔ جن افغان مہاجرین نے پاکستان میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے ان میں سے کئی کا کہنا ہے افغانستان میں ان کے لیے معاشی مواقع نہیں ہیں جو انہیں وہاں جانے کی ترغیب دے سکیں۔ پاکستان میں پیدا ہونے والے افغانوں کی دوسری اور تیسری نسل میں سے کئی کبھی بھی افغانستان نہیں گئے۔ اس لیے پاکستان میں اپنا بستر بوریا لپیٹ کر افغانستان منتقل ہونا ان کے لیے بہت مشکل ہے۔

یو این ایچ سی آر نے کل 14,017 افغانوں کے کوائف جمع کیے ہیں جو یکم دسمبر 2018 تک وطن واپس گئے۔ ان لوگوں کو کوئٹہ، بلوچستان اور نوشہرہ، خیبر پختونخوا میں واقع دو رضا کارانہ وطن واپسی مراکز کے ذریعے وطن واپس بھیجا گیا۔

یو این ایچ سی آر کے مطابق، 2018 میں افغان مہاجرین کو پاکستان سے افغانستان بھیجنے والے بنیادی عوامل میں سرحد میں داخل ہونے کی سخت شرائط (42 فیصد)، ذرائع روزگار کا ضیاع (12 فیصد)، سہولیات تک رسائی سے انکار (8 فیصد)، اور پی او آر کارڈز کی توسیع کے بارے میں غیر یقینی صورتحال (5 فیصد) شامل ہیں۔ افغانستان واپس جانے پر مائل کرنے کی بنیادی وجوہ میں خاندان کے ساتھ دوبارہ ملاپ (80 فیصد)، روزگار کے مواقع (9 فیصد)، ایذا رسانی کے خوف کا باقی نہ رہنا (3 فیصد)، گھر واپسی (2 فیصد) اور یو این ایچ سی آر کا امدادی پروگرام (2 فیصد) شامل ہیں یہ حقائق 2,912 گھرانوں کے سربراہوں کے انٹرویوز سے حاصل ہوئے۔ یہ انٹرویوز یو این ایچ سی آر نے پاکستان میں واقع رضا کارانہ وطن واپسی مراکز میں کیے تھے۔

یو این سی ایچ آر نے اُن 1,290 افراد کا بھی انٹرویوز کیا تھا جو حال ہی میں پاکستان سے افغانستان واپس آئے تھے۔ ان میں سے 37 فیصد نے کہا کہ انہوں نے پاکستان اس لیے چھوڑا کیونکہ وہاں ملازمت کے مواقع نہیں تھے جبکہ 24 فیصد کا کہنا تھا کہ اس کی وجہ سرحد میں داخلے کی سخت شرائط کا ہونا ہے۔ حال ہی میں واپس جانے والے مہاجرین میں سے 10 فیصد نے کہا کہ پاکستان میں رہنے کے اخراجات بہت زیادہ ہیں جس وجہ سے وہ یہ ملک چھوڑ رہے ہیں جبکہ چھ فیصد نے کہا کہ اس کی وجہ پی او آر کارڈز کی توسیع کے بارے میں غیر یقینی صورتحال کا ہونا ہے۔ ایسا ہوسکتا ہے کہ زیادہ تر مہاجرین نے کئی عوامل کو مدنظر رکھ کر افغانستان واپسی کی راہ اپنائی ہو۔

اندرون ملک نقل مکانی

اندرون ملک نقل مکانی کا مسئلہ خاص طور پر، خیبر پختونخوا کے (مغربی اضلاع) میں کشیدگی اور فوجی آپریشنوں کے باعث گذشتہ چند برسوں کی طرح 2018 میں بھی پریشانی کا سبب بنا رہا۔ 2008 سے لے کر اب تک فاٹا کے 53 لاکھ باشندے بے دخل ہوئے ہیں۔ اگرچہ ان کی اکثریت اپنے گھروں کو لوٹ گئی ہے مگر ان کی بڑی تعداد اب بھی واپسی کی منتظر ہے۔

فاٹا ڈیزاسٹر مینجمنٹ اتھارٹی (ایف ڈی ایم اے) کے مطابق، 19 دسمبر 2018 تک 22,915 رجسٹرڈ اور تقریباً 217,143 غیر رجسٹرڈ آئی ڈی پیز سابق فاٹا میں اپنے آبائی علاقوں کو واپس لوٹ گئے ہیں۔ ایف ڈی ایم اے کے مطابق 16,136 آئی ڈی پیز خاندانوں کو ابھی واپس لوٹنا ہے۔ واپس لوٹنے والے آئی ڈی پیز کی

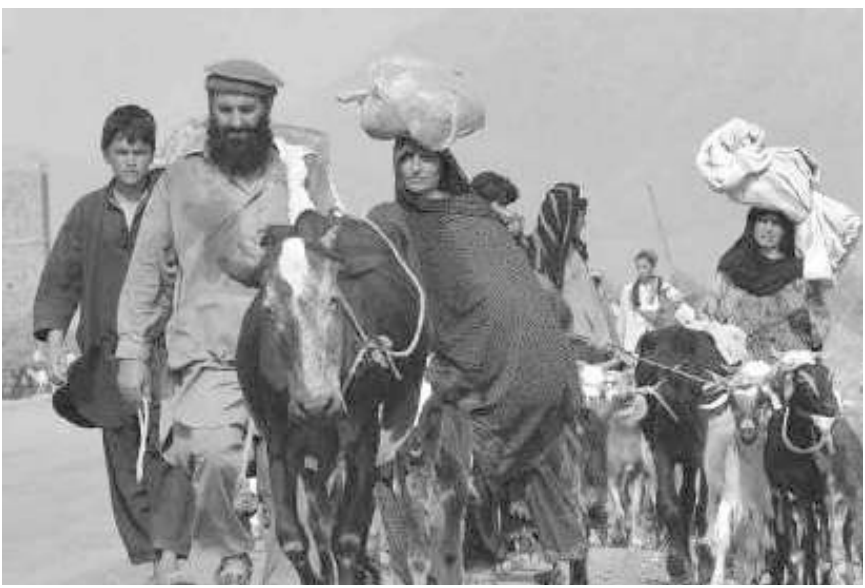

فوجی آپریشن کے بعد کرم ایجنسی واپس آنے والے سینکڑوں خاندان ابھی تک حکومتی معاوضے کے منتظر ہیں

اکثریت قبائلی ضلع شمالی وزیرستان سے تھی جبکہ اس سے کم ضلع خیبر، جنوبی وزیرستان، اورکزئی اور کُرم سے تھے۔ ایف ڈی ایم اے کے کوائف کے مطابق قبائلی ضلع شمالی وزیرستان (15,017) اور قبائلی ضلع خیبر (1,119) سے تعلق رکھنے والے باقی ماندہ آئی ڈی پیز ابھی تک اپنے علاقوں کو واپس نہیں گئے۔

آزاد تجزیہ کاروں، فیلڈ میں کام کرنے والے ایچ آر سی پی کے مانیٹرز اور آئی ڈی پیز کے ساتھ کام کرنے والی تنظیموں کا کہنا ہے کہ آئی ڈی پیز جنہیں فاٹا میں اپنے گھر چھوڑنے پر مجبور کیا گیا اور جو ابھی بھی اپنے گھروں سے بے دخل ہیں، کی تعداد اس سے بہت زیادہ ہے جو ایف ڈی ایم اے اور حکومت نے بتائی ہے۔

آئی ڈی پیز جو اپنے گھروں کو واپس لوٹ گئے ہیں، نے دیکھا کہ ان کے علاقوں کا انفراسٹرکچر مکمل یا جزوی طور پر تباہ ہو گیا ہے۔ گذشتہ کئی برسوں سے جاری تشدد اور فوجی آپریشنوں کی وجہ سے فاٹا کی ایجنسیوں کی مقامی معیشتیں شدید متاثر ہوئی ہیں اور واپس لوٹنے والی کمیونٹیوں کو پائیدار روزگار کی فراہمی کے لیے حکومت کی طرف سے بظاہر کوئی کوشش نظر نہیں آئی۔ مقامی کمیونٹیوں کے ان دعووں کی فیلڈ میں موجود ایچ آر سی پی کے مانیٹرز نے تصدیق کی ہے۔

حکومت نے اعلان کیا تھا کہ رجسٹرڈ آئی ڈی پیز خاندانوں کو فوری ضرورت کے لیے 25,000، ٹرانسپورٹ کے لیے 10,000 اور گھروں کو پہنچنے والے نقصانات کے سرکاری تخمینے کی بنیاد پر گھروں کی تعمیر کے لیے 400,000 روپے دیے جائیں گے۔ آئی ڈی پیز کا کہنا تھا کہ یہ رقم ان کے گھروں کی تعمیرِ نو کے لیے کافی نہیں ہے۔ حکومت نے خیبر پختونخوا میں فاٹا کے انضمام سے پہلے فاٹا کی ترقی کے لیے 2018-19 کے لیے 24.5 ارب روپے مختص کیے تھے۔ تاہم، 2018 کے اختتام پر اطلاعات سامنے آئیں کہ وفاقی حکومت نے سابق فاٹا کے سالانہ ترقیاتی فنڈ میں 20 فیصد کٹوتی کر کے 20.4 ارب روپے کر دیا ہے۔ مزید اطلاع ملی کہ فاٹا اور خیبر پختونخوا کے انضمام سے پیدا ہونے والے قانونی و انتظامی مسائل نے فنڈ کی ادائیگی اور تخصیص کو متاثر کیا ہے۔ اس کا واپس آنے والے اندرون ملک نقل مکینوں پر اثر پڑا ہے، خاص طور پر اس وجہ سے کہ صحت اور تعلیم پر خرچ گذشتہ برسوں کی نسبت کم ہو گیا ہے۔

فاٹا کے مقامی سماجی اور سیاسی کارکنوں کا دعویٰ ہے کہ یہ فنڈز ناکافی تھے اور ان سے آئی ڈی پیز اور فاٹا کے باشندے اپنے گھروں اور ذرائع روزگار کی تعمیرِ نو نہیں کر سکتے تھے۔ کرم ایجنسی سے سامنے آنے والی اطلاعات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ فوجی آپریشنوں کے بعد اپنے گھر واپس آنے والے سینکڑوں خاندانوں کو ابھی تک معاوضہ نہیں دیا گیا جس کا حکومت نے ان سے وعدہ کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تعمیرِ نو و بحالی نو یونٹ (آر آر یو) نے گھروں کو پہنچنے والے نقصان کا تخمینہ لگانے میں تاخیر کر دی تھی۔ سابقہ حکومت نے سابق فاٹا کے لوگوں کے نقصان کا ازالہ کرنے کے لیے شہری نقصان ازالہ پروگرام (سی ایل سی پی) شروع کیا تھا جس کے تحت قبائلی اضلاع میں مکمل تباہ شدہ گھر کے لیے 400,000 روپے اور جزوی تباہ شدہ گھر کے لیے 160,000 روپے کی پیشکش کی گئی تھی۔ اطلاعات کے مطابق 3,625 خاندانوں نے مکمل تباہ شدہ گھر کا معاوضہ اور 1,847 خاندانوں نے جزوی تباہ شدہ گھر کا معاوضہ وصول کیا

تھا مگر اپنے علاقوں میں واپس آنے والے باقی ماندہ گھرانے ابھی تک معاوضے کے منتظر ہیں۔

ایف ڈی ایم اے نے نومبر 2018 میں اعلان کیا تھا کہ وہ تمام ادائیگیاں کردے گا جو 2016 کی پالیسی کی وجہ سے التواء کا شکار ہیں جس پالیسی کی رو سے متاثرہ خاندانوں کو ٹرانسپورٹیشن کے لیے 10,000 روپے کی گرانٹ اور ہنگامی خرچ کے لیے 35,000 روپے کا مطالبہ انہیں اپنی واپسی کے فوری بعد کرنا چاہیے تھا۔ مزید یہ بھی کہا گیا کہ بے دخل ہونے والے خاندانوں کے 200 سے زائد بلاک شدہ سم کارڈ بھی دوبارہ فعال کردیے جائیں گے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کیونکہ متاثرہ خاندانوں کو گرانٹس کی ادائیگی سم کارڈز کے ذریعے ہی ہوتی ہے۔ مزید برآں، دسمبر 2018 میں کہا گیا کہ ایف ڈی ایم اے نے قبائلی ضلع شمالی وزیرستان سے تعلق رکھنے والے ان 15,200 خاندانوں کے لیے 52 کروڑ روپے کا تین ماہ کا مالیاتی پیکج جاری کیا ہے جو بنوں کے باکا خیل کیمپ میں مقیم تھے تاکہ وہ سخت سردی سے بچنے کے لیے انتظامات کرسکیں۔ کیمپ میں مقیم آئی ڈی پیز کئی ماہ تک احتجاج کرتے رہے کہ انہیں مالی مدد نہیں دی جارہی جس کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا جس کے بعد یہ اقدام کیا گیا۔

قبائلی اضلاع کے باشندوں کی یہ شکایت اب بھی ہے کہ انہیں گذشتہ برسوں کی طرح اب بھی قومی بحث میں نظرانداز کیا جارہا ہے۔ انتہائی کم یا بالکل ہی میڈیا کوریج نہ ہونے کی وجہ سے ان کے لیے اپنے مسائل کو اجاگر کرنا بہت مشکل تھا۔

امن وامان سے متعلق تحفظات

اگرچہ حکومت کا دعویٰ ہے کہ گذشتہ برسوں کے دوران کئی فوجی آپریشنوں کے بعد خیبر پختونخوا کے قبائلی اضلاع (سابق فاٹا) کے زیادہ تر علاقے شدت پسندوں کے قبضے سے آزاد کروالیے گئے ہیں تاہم پورے سابق فاٹا میں امن وامان سے متعلق تحفظات بدستور موجود ہیں۔ فاٹا ریسرچ سنٹر کے مطابق اگرچہ 2018 کے دوران شدت پسندوں کے حملوں کی اطلاعات تقریباً تمام قبائلی اضلاع سے ملتی رہیں مگر 2017 کی نسبت دہشت گردی کے واقعات میں 17 فیصد اور انسداد دہشت گردی کے واقعات میں 20 فیصد کمی آئی ہے۔

خیبر پختونخوا میں فاٹا ریسرچ سنٹر کی رپورٹ 'قبائلی اضلاع سالانہ سلامتی رپورٹ 2018' کے مطابق خاص طور پر قبائلی ضلع شمالی وزیرستان میں اس قسم کے سب سے زیادہ حملے پیش آئے۔ شمالی وزیرستان میں ہونے والے حملوں کی تعداد 58 تھی، باجوڑ 21 حملوں کے ساتھ دوسرے نمبر پر تھا، جبکہ خیبر میں 18، جنوبی وزیرستان میں 16، مہمند میں 7، کرم میں 5 اور اورکزئی میں 3 حملے ہوئے۔

تمام ایجنسیوں میں پورا سال مختلف اوقات پر مختلف مدت کے لیے کرفیو نافذ ہوتے رہے۔ اکثر اوقات ہونے والے حملوں اور بعدازاں انسداد دہشت گردی کی کاروائیوں اور ان کے ساتھ امن وامان کی صورتحال کے باعث نافذ ہونے والے کرفیو نے تقریباً تمام قبائلی اضلاع کے لوگوں کی زندگیوں کو متاثر کیا۔

وزیرستان میں چیک پوسٹوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے خلاف پشتون تحفظ موومنٹ (پی ٹی ایم) کے

وزیرستان واپس آنے والے لوگوں کو 'وطن کارڈز' کے نام سے خاص شناختی کارڈ جاری کیے گئے

احتجاجی مظاہروں کے بعد، پاکستان کی فوج نے اپریل میں اعلان کیا کہ چیک پوسٹیں کم کی جائیں گی اور مقامی لوگوں کے تحفظات دور کیے جائیں گے۔

نقل وحرکت پر پابندیوں سے مقامی لوگوں کے لیے مشکل ہوگیا کہ وہ اپنے علاقوں میں اپنی زندگیوں کو از سر نو شروع سکیں جہاں تعلیم، روزگار اور کاروبار کے مواقع بہت قلیل تھے۔ وزیرستان واپس آنے والے مقامی لوگوں کو وطن کارڈز' کے نام سے خصوصی شناختی کارڈز دیے گئے مگر جیسا کہ دسمبر 2018 میں ضلعی انتظامیہ نے اعلان کیا تھا، جنوری 2019 تک صورتحال یہ تھی کہ شمالی وزیرستان داخل ہونے والے لوگوں کو داخل ہونے کے لیے صرف سی این آئی سیز کی ضرورت تھی اور انہیں کسی قسم کے پیشگی اندراج یا اجازت نامے کی ضرورت نہیں تھی۔

سابق وزیر اعظم نے دوبارہ تعمیر ہونے والے میرانشاہ بازار کا اپریل 2018 میں افتتاح کیا اور اس موقع پر کہا کہ عارضی طور پر بے دخل ہونے والوں (ٹی ڈی پیز) کی بحالیِ اور (سابق) فاٹا کی سماجی ومعاشی ترقی حکومت کی ترجیح ہے مگر تاجروں کے حالیہ مظاہروں میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ 1300 دوکانات کے بازار میں دوکانوں کی منصفانہ تقسیم کی جائے۔

مئی 2018 میں شمالی وزیرستان کے علاقے میرعلی اور لنڈ مہمند خیل میں زمینی فوجی آپریشن شروع کیا گیا اور علاقے میں کرفیو بھی نافذ کیا گیا۔

جون 2018 میں، اطلاعات سامنے آئیں کہ فوج نے آپریشن ردالفساد کے تحت جنوبی وزیرستان کے علاقے لدھا میں ایک آپریشن شروع کیا ہے۔ آپریشن خفیہ اطلاعات کی بنیاد پر کیا گیا۔ اطلاعات تھیں کہ واپس آنے

والے آئی ڈی پیز کے ساتھ شدت پسند بھی علاقے میں داخل ہو گئے تھے۔ آپریشن میں چھ مشتبہ دہشت گرد' مارے گئے۔

ستمبر 2018 میں شمالی وزیرستان میں کرفیو کے نفاذ کے ساتھ ایک فوجی آپریشن شروع ہونے کی اطلاعات بھی موصول ہوئیں۔

بیک وقت، وانا، جنوبی وزیرستان میں نام نہاد 'امن کمیٹی' کے لبادے میں کالعدم طالبان کے بعض گروہوں کے دوبارہ سر اٹھانے کی اطلاعات بھی ملیں۔ کمیٹی نے مقامی آبادی کے لیے پمفلٹوں اور مقامی مساجد کے ذریعے کچھ کاموں سے اجتناب کرنے کی ہدایت کی اور تنبیہ کی کہ ان ہدایات کی پاسداری نہ کرنے والوں کو سنگین نتائج بھگتنا پڑیں گے۔ انہوں نے جن اقدامات کا اطلاق کیا ان میں عورتوں کے باہر نکلنے اور موسیقی پر پابندی شامل تھی۔ حکومتی اہلکاروں نے ایسی کسی بھی سرگرمی کے وجود کی تردید کی مگر مقامی لوگوں اور مقامی ذرائع ابلاغ نے ایسی اطلاعات دینی جاری رکھیں کہ امن کمیٹی کے لوگ علاقوں کا کنٹرول سنبھالنے کی کوشش اور مقامی لوگوں کو خوفزدہ کر رہے ہیں۔

اطلاعات کے مطابق 3 جون کو ضلع جنوبی وزیرستان کے علاقے وانا میں مقامی طالبان شدت پسندوں نے پشتون تحفظ موومنٹ (پی ٹی ایم) کے دو کارکنوں کو قتل جبکہ 25 کو زخمی کر دیا۔

حالیہ فوجی آپریشنوں کے باوجود طالبان گروہوں کے دوبارہ سر اٹھانے کی خبروں نے شدید تشویش پیدا کی ہے۔ ایچ آر سی پی نے متعلقہ حکام سے اپیل کی ہے کہ نہ صرف اس سنجیدہ مسئلے کا نوٹس لیا جائے بلکہ خیموں میں پڑے آئی ڈی پیز کے مسائل کا بھی ازالہ کیا جائے۔

وزیرستان کے آئی ڈی پیز کی افغانستان نقل مکانی

2014 میں شمالی وزیرستان میں آپریشن 'ضرب عضب' شروع ہوا تو ایک اندازے کے مطابق تقریباً پانچ لاکھ مقامی لوگ بے دخل ہوئے تھے۔ بعض لوگ جو آئی ڈی پیز بننے پر مجبور ہوئے، انہوں نے افغانستان میں پناہ لینے کو ترجیح دی۔

اس وقت یو این ایچ سی آر کے اندازوں کے مطابق، پاکستان سے 291,800 آئی ڈی پیز افغانستان گئے۔ ان میں سے زیادہ تر افغانستان کے صوبہ خوست کے ضلع گربوز میں واقع گولن کیمپ میں قیام پذیر ہوئے۔ مئی 2015 تک ایک اندازے کے مطابق افغانستان کے صوبہ خوست اور پکتیکا میں 205,000 افراد پر مشتمل وزیرستان کے آئی ڈی پیز کے تقریباً 32,576 گھرانے رہائش پذیر تھے۔

یو این ایچ سی آر کے مطابق، افغانستان کے صوبہ خوست اور پکتیکا میں 3,937 نئے پاکستان مہاجرین رجسٹر ہوئے تھے اور ستمبر 2018 تک افغانستان میں پاکستانی مہاجرین کی کل تعداد 75,576 تھی۔

ستمبر 2018 میں رپورٹ ہوا کہ کئی پاکستانی خاندان جو شمالی وزیرستان میں فوجی کاروائیوں کی وجہ سے افغانستان گئے تھے، غلام خان اور انگوراڈہ کے مقام پر دونوں اطراف سے سرحد بند ہونے کے باعث واپس نہیں

شمالی وزیرستان سے نقل مکانی کرنے والے لوگوں نے حکومتی توجہ حاصل کرنے کے
لیے گورنر ہاؤس پشاور کے سامنے روایتی وزیری اتن رقص کیا

آپا رہے۔ ایف ڈی ایم اے نے تقریباً 1,500 گھرانوں کو افغانستان سے واپس شمالی وزیرستان جانے کے لیے 20 اپریل 2018 کی حتمی تاریخ دی تھی۔ ایف ڈی ایم اے کے ترجمان کو یہ کہتے ہوئے رپورٹ کیا گیا کہ یہ تنظیم سرحد عبور کروانے کے لیے لوگوں کی کچھ زیادہ مدد نہیں کر سکی کیونکہ وہ سرحد کی دوسری طرف تھے۔

اکتوبر 2018 میں افغانستان سے واپس لوٹنے والے شمالی وزیرستان کے آئی ڈی پیز نے حکومتی توجہ حاصل کرنے کے لیے پشاور میں گورنر ہاؤس کے سامنے روایتی وزیری اتن رقص کیا۔ وہ افغانستان میں مقیم باقی گھرانوں کی وطن واپسی میں حکومتی ناکامی کے خلاف احتجاج کر رہے تھے۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ حکومت ان کے فنڈز جاری کرے کیونکہ حکومت نے ہر خاندان کو بے دخلی کے وقت اور علاقے کو ان کی واپسی کے لیے خالی قرار دینے کے وقت 12,000 روپے دینا تھے۔ تاہم، یہ معاملہ اس وقت اجاگر ہوا جب لوگوں نے دیکھا کہ ان کے گھر تباہ ہو چکے تھے اور چونکہ ان کے پاس رہنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی اس لیے انہیں دوبارہ اپنا علاقہ چھوڑنا پڑا۔ ایسے گھرانوں کے لیے معاوضہ اس وقت دیا جائے گا جب دو قبائلی عمائدین ان کی بے دخلی کی تصدیق کریں گے اور پھر ڈپٹی کمشنر کے دفتر سے بھی اس امر کی تصدیق ہوگی۔

ایف ڈی ایم اے کے مطابق، پاکستانی مہاجرین کے تقریباً 6,664 گھرانے خوست، افغانستان سے پاکستان کے قبائلی اضلاع واپس بھیجے گئے جبکہ 2,773 گھرانے خوست میں ہی تھے۔ اس حوالے سے ایف ڈی ایم اے کے دعووں کی صداقت جاننا مشکل ہے۔ پاکستان کے سرکاری حکام افغانستان میں مقیم آئی ڈی پیز کو وزیرستان واپس آنے پر قائل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر انہیں اس سلسلے میں مکمل کامیابی نہیں ملی۔

دوسرا نقطہ نظر

بعض اوقات مشکل ترین حالات غیر متوقع نتائج پیدا کر دیتے ہیں۔ اطلاعات کے مطابق، بے دخلی کے دوران جب خیبر پختونخوا کے قبائلی ضلع کو شدت پسندوں سے پاک کیا جا رہا تھا تو وادیِ تیراہ کے رہائشیوں کا طرز زندگی پانچ برس کی بے دخلی کے دوران حیرت انگیز حد تک تبدیل ہوا ہے۔ شہری زندگی اور جدید سہولیات سے سے روشناس ہوئے اور اب وہاں کے لوگوں کے گھروں میں شمسی توانائی کے پلانٹ اور ٹیلی ویژن ہیں اور عورتوں کو ٹی وی پروگرام دیکھنے اور ان سے سیکھنے کی اجازت ہے۔ حفظان صحت اور کھانے کی عادات بہتر ہوئی ہیں، اور یہاں تک کہ کمروں کا سائز کم کرنے کے لیے ان کے گھروں کا ڈیزائن بھی تبدیل ہو گیا ہے تا کہ کمروں کا سائز چھوٹا ہو اور کمرے گرم رکھنے کے لیے مقامی جنگلات کی لکڑی پر انحصار کم ہو جائے۔

بنگلہ دیش میں پھنسے پاکستانیوں کی حالتِ زار

تقریباً ڈھائی لاکھ پاکستانی 1971 سے بنگلہ دیش میں پھنسے ہوئے ہیں۔ یہ بہاری برادری سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں جنہوں نے اُس وقت مغربی پاکستان سے علیحدگی کی مخالفت کی تھی۔ ان کا اصرار تھا کہ وہ پاکستانی ہیں اور بنگالی نہیں ہیں جس وجہ سے بنگلہ دیش کے قیام کے بعد بہاریوں کو غدار تصور کیا گیا۔

گو کہ بنگلہ دیشی سپریم کورٹ نے 1972 میں کہا تھا کہ بہاری بنگلہ دیش کی شہریت کے مستحق ہیں، ان میں سے کئی نے پاکستانی پاسپورٹ اور پاکستان کی شناختی دستاویز رکھنے کو ترجیح دی۔ اگرچہ شروع شروع میں پاکستان نے ان میں سے چند ایک کو اپنے ملک بلا لیا تھا، تاہم بہاریوں کی اکثریت ابھی بھی بنگلہ دیش میں پھنسی ہوئی ہے کیونکہ پاکستان نے انہیں واپس لینے کا سلسلہ مکمل طور پر بند کر دیا تھا۔ ان پھنسے پاکستانیوں کی حالت زار کا ازالہ کرنے کے لیے 2018 میں کچھ بھی نہیں کیا گیا۔

دوسری طرف، پاکستان میں بہاری، جن میں سے زیادہ تر کراچی میں قیام پذیر ہیں، کو شناختی دستاویزات سے متعلق مسائل درپیش ہیں۔ دسمبر 2018 میں ایک اخباری اطلاع کے مطابق نیشنل ڈیٹا بیس رجسٹریشن اتھارٹی (نادرا) نے کراچی میں بہاریوں کے کمپیوٹرائزڈ قومی شناختی کارڈ بلاک کر دیے تھے یا ان کی تجدید کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ بنگلہ دیش کی آزادی کے بعد، بنگلہ دیشی حکومت نے 1972 سے 1992 کے دوران تین مراحل میں تقریباً 170,000 بہاریوں کو پاکستان بھیجا۔ وطن واپسی کے سرٹیفکیٹ صرف انہیں ملے جو 1974 میں وطن واپسی معاہدے کے تحت آئے تھے، اور ان لوگوں کو ایسی دستاویز نہیں دی گئی تھی جو 1980 کی دہائی میں پاکستان آئے تھے۔ فعال سی این آئی سی نہ ہونے کی وجہ سے پاکستان میں بہاری لوگ ملازمتوں کے مواقع سے محروم ہیں، جائیداد نہیں خرید سکتے، نہ ہی گاڑیاں خرید یا رجسٹر کر سکتے ہیں اور نہ ہی بینک اکاؤنٹ کھول سکتے ہیں۔

سفارشات

☆ یو این سی ایچ آر کی مدد اور افغان و عالمی برادری کے تعاون سے افغان مہاجرین کے مسائل کے حل لیے پائیدار اقدامات کیے جائیں تا کہ یہ یقینی ہو سکے کہ پاکستان سے افغانستان تمام مہاجرین کی وطن واپسی رضا کارانہ اور عالمی اقدار کی مطابقت میں ہو۔

☆ مہاجرین کنونشن 1951 اور پروٹوکول 1967 پر دستخط کیے جائیں جو ملک میں مہاجرین کے معاملے سے بنٹنے کے لیے قوانین واضح کرتے ہیں۔

☆ اندرون ملک نقل مکانی پر اقوام متحدہ کے رہنماء اصولوں کو ملکی پالیسی اور قانون کا حصہ بنایا جائے تا کہ وقتی اقدامات پر انحصار سے بچا جا سکے۔ سب سے پہلی ترجیح تو یہ ہونی چاہیے کہ اندرون ملک نقل ہو ہی نا اور جہاں کہیں یہ ناگزیر ہو وہاں کوشش یہ کی جائے کہ اس کے منفی اثرات کم سے کم پڑیں۔

☆ آئی ڈی پیز کے علاقوں میں انفراسٹرکچر کی بحالی کے حوالے سے کوئی بھی فیصلہ لیتے وقت آئی ڈی پیز خاص طور پر آئی ڈی پیز کی سب سے زیادہ غیر محفوظ آبادی کو فیصلے کے عمل میں شامل کیا جائے اور ان سے مشورہ کیا جائے

☆ بنگلہ دیش میں پھنسے پاکستانیوں کے مسئلے کو فی الفور حل کیا جائے اور بے وطن پاکستانیوں کی خواہشات کا احترام کیا جائے۔ ان میں سے جو پاکستان کے شہری بننا چاہتے ہیں انہیں جلد از جلد وطن واپس لایا جائے۔

☆ قبائلی اضلاع سے نقل مکانی کرنے والے لوگوں، نیز بہاریوں کے شناختی کارڈز بلاک ہونے والے معاملے کا ترجیحی بنیادوں پر نوٹس لیا جائے۔